درد دل
(افسانے)
ستارہ جعفری
نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

(افسانے)

ستارہ جعفری

نئی آواز - جامعہ نگر - نئی دلی ۲۵

ترتیب

اپنے عزیز بھائی علی سردار جعفری

کے نام

جن کے زیرِ سایہ ادب اور زندگی کا شعور حاصل ہوا

ستارہ جعفری

ایک انسان دوست افسانہ نگار

ستارہ جعفری اُس کثیر الجہت اردو تہذیب کی پروردہ ہیں جس نے ادب، شاعری، زباں دانی اور طرزِ معاشرت کی نفاست اور شائستگی کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا (اس نوع کی رچی ہوئی تہذیب ہندستان سے باہر محض فرانس، ایران اور جاپان میں نظر آئی تھی) اس تمدن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو نکھرے ہوئے احساس اور شعور کی دولت عطا کی اور انسانیت کی اعلا اقدار کی پرکھ سکھلائی۔ اس بات کو غالباً آج آسانی سے نہیں سمجھایا جاسکتا کہ جس گھریلو تہذیبی روایت میں میر انیسؔ کے مراثی اور ان کا تاریخی پس منظر شامل تھا اس نے حق و باطل اور انصاف اور بے انصافی کی باہم آویزش میں حق اور عدل سے وابستگی کے رویّے کو جنم دیا تھا۔ اہل تصوّف کی انسان دوستی بھی اس ثقافتی میراث میں شامل تھی۔

اس تمدنی روایت کے جاگیری پہلو پر بہت زیادہ زور دے کر اس کے مثبت عناصر کو عموماً نظر انداز کیا گیا ہے۔

میں اس پس منظر کا تذکرہ اس لیے بالخصوص کر رہی ہوں کہ ہر ادیب کی شخصیت اور ادب کی تشکیل میں اس کی بیک گراؤنڈ بھی کارفرما رہتی ہے۔ علاوہ ازیں آج جہانِ سوئم کے

ادیب کے لیے انگریزی تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری تصوّر کیا جاتا ہے تاکہ وہ مغربی ادب کی خوشہ چینی کرسکے۔ ستارہ جعفری خرابیِ صحت کی وجہ سے مغربی تعلیم حاصل نہ کرسکیں اس لحاظ سے وہ ان خواتین کے زمرے میں بھی آتی ہیں جنھوں نے کالج میں پڑھے بغیر ادب کے میدان میں قدم رکھا۔

دراصل اردو تہذیب (یہ اصطلاح بھی ایجاد بندہ ہے) کی آبیاری عورتوں ہی نے کی تھی۔ آج "مغلئی فوڈ" کی طرح لفظ "بیگم" یا "بیگمات" بھی بڑی EXOTIC حیثیتیں اختیار کرچکا ہے۔ خود اردو ہندستان میں ایک HOT-HOUSE CULTURE بنتی جارہی ہے اور اس طرزِ معاشرت کا شیرازہ بکھر رہا ہے جس نے اس زبان اور ان اقدار کی تخلیق کی تھی۔ (آج کا اردو پریس بھی انتہائی جاہلانہ انداز میں ہندی اخباروں کی طرح "تاناشاہی" بمعنی نادرشاہی استعمال کرتا ہے) ادھر ستارہ جعفری کا حال یہ ہے کہ وہ اب بھی آگرے کی ٹکسالی زبان کی نام لیوا ہیں۔

میں ادب کو مردانہ اور زنانہ خانوں میں بانٹنے کی قائل نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جین آسٹن سے لے کر آج تک عورتوں ہی نے دنیا میں ہر جگہ افسانے کو ایک مخصوص دردمندی اور لوچ بخشا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد تباہ حال انقرہ کے ایک چھے سالہ اخبار فروش یتیم بچّے رستم کا دل کو چھو لینے والا قصّہ خالدہ ادیب خانم ہی لکھ سکتی تھیں۔ عورت ماں کی نظر سے دنیا کو دیکھتی ہے اور اس وجہ سے بنیادی طور پر وہ امن و آشتی کی خواہاں ہے۔ علاوہ ازیں گھریلو ماحول کی جزویات نگاری انسانی رشتوں کی نزاکتیں "ماں"، بہن، بیٹی اور بیوی کے لطیف ترین جذبات ان کے خوف و دہشت، مسرتوں اور غموں کی عکاسی عورت ہی بہتر طور سے کرسکتی ہے۔ فکشن سے فطری مناسبت اسے شاید اس لیے بھی ہے کہ وہ بچّوں کو کہانی سناتی ہے۔ دادی اور نانی بن کر وہ قصّہ گوئی کی روایت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے وہ گوسپ gossip کی شوقین اور گھریلو روزمرّہ کی زندگی کے واقعات کو پڑوس یا شوہر سے دہرانے کی عادی ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ دنیا کا پہلا ناول "گنجی کی کہانی" ایک جاپانی خاتون لیڈی موراساکی نے آج سے تقریباً ایک ہزار سال

قبل گیارہویں صدی عیسوی میں لکھا تھا! اور ہر کہانی کا رخا تون الف لیلا کی شہرزاد ہے
اس کے باوجود دنیا کے ادب میں عورتوں کو ہمیشہ سکنڈ کلاس شہری کا درجہ دیا گیا۔
خود اردو میں دیکھ لیجیے ڈپٹی نذیر احمد کی ہم عصر رشیدۃ النسا بیگم نے ۱۸۸۰ء میں ناول لکھا تھا مگر اسے چھپوا نہ سکیں اور وہ بیس سال بعد شائع ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد اور ترقی پسند تحریک کے پروٹسٹ لٹریچر کے آغاز کے درمیان جو پچاس پچپن سال کا وقفہ ملتا ہے اس کے اولین حصے میں عورتوں نے بھی پروٹسٹ لٹریچر تخلیق کیا اور چند اعلا درجے کے ناول لکھے جو مروّجہ تکنیک کے اعتبار سے بھی قابل ذکر تھے۔ لیکن ان خواتین کے نام تک فراموش کر دیے گئے ہیں۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد سمیت اس دور کے مرد ادیبوں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالے لکھتے لوگ نہیں تھکتے۔

ستارہ جعفری 'زنانہ لٹریچر' تخلیق کرنے والیوں کے گروہ میں شامل نہیں (اپنی صلاحیتوں کے باوجود یہ بھی اردو ادب کے سکنڈ کلاس شہریوں کا گروہ رہا ہے) زنانہ لٹریچر کے علاوہ ایک اور گروہ عام پسند رومینٹک ناول لکھنے والیوں کا بھی ہے۔ یہ بہت مقبول لیکھیکائیں ہیں۔

پروفیسر وقار عظیم نے فتوا دیا کہ اس دور کی خواتین کے لکھے ہوئے ناول فنی لحاظ سے ادنا درجے کے ہیں۔ ہندستان میں اور پاکستان میں ایک ایک مصنفہ پچاس پچاس ناول لکھ چکی ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی مقبول ترین ڈراما نگار زیادہ تر خواتین ہی ہیں۔ ان کے افسانے ڈائجسٹوں میں شامل ہوتے ہیں ان کو بھی بنظر استہزا دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ اپنے کرافٹ کے بدولت ہی مقبول کمرشیل ناولوں اور سیریل افسانوں کی COMPETITIVE مارکیٹ پر چھائی ہوئی ہیں اور مالی طور پر نہایت منفعت بخش ناول اور افسانے لکھ رہی ہیں۔

ستارہ اس گروپ میں بھی شامل نہیں۔ اوّل تو وہ لکھتی بہت کم ہیں اور ان کے ہر افسانے میں کوئی مقصد یا آدرش چھپا ہوتا ہے۔ بمبئی کے طویل قیام کے دوران انھوں نے یہاں کی بے رحم اجتماعی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور ان کے بارے میں لکھا اور براڈکاسٹ کیا ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اپنی طویل علالتوں کے باوجود انھوں نے

بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ اپنی تخلیقی لگن کو فروزاں رکھا ہے۔ ان کے افسانے سادہ اور پرسوز ہیں۔ انھوں نے دردِ دل جیسی بڑھیا کہانی بھی لکھی ہے اور سیدھے سادے بیانیہ قصے بھی جن کو MODERN PARABLES کہا جا سکتا ہے۔

ستارہ پل بنانا چاہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانیت کے مصائب اور تباہ کاریاں اس طرح بڑھتی جا رہی ہیں کہ انسان، فرقے، قومیں ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتیں یا سمجھنا نہیں چاہتیں۔ ان تعصبات اور نفرتوں اور غلط فہمیوں نے انسانوں کے درمیان جو کھائیاں حائل کر دی ہیں ستارہ ان کو پاٹنے کی آرزومند ہیں۔ "جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے"، "سمجھوتہ ایکسپریس"، "پاکستان کا پہلا عید کارڈ"، اور "بھائی بھائی" مصنفہ کی اسی پرخلوص خواہش کے ترجمان ہیں۔

"سنہرا خواب" کا غریب راسو بڑے ذوق و شوق سے پنچسالہ پلان کی نمائش دیکھنے جاتا ہے۔ وہ ایک تنگ و تاریک کھولی میں بارہ آدمیوں کے ساتھ زلیست کرتا ہے اور جب اسے دق ہوتی ہے تو ہسپتال کے برآمدے میں پڑا پڑا مر جاتا ہے۔ کیوں کہ اسے خیراتی وارڈ میں بھی پلنگ میسر نہیں۔

مجھے یقین ہے بہت سے قاری بڑے سپر انٹلکچوئل انداز میں اس افسانے پر ایک "عام سکہ بند ترقی پسند بیانیہ قصے" کا لیبل چسپاں کریں گے اور ان کے اسی رویّے سے ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوگا۔

سماجی بے انصافی شکستِ خواب اور شدید افلاس کے ان حقائق کی عکاسی نے آج سے چالیس پینتالیس سال قبل اردو افسانے کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ لیکن پچھلی ربع صدی میں ہم اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہمارے BRUTALISATION کی پروسس اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ستارہ جعفری کے راسو کی موت کوئی لہر پیدا نہ کر سکے گی۔

پریم چند صدی میں کفن ایک قسم کا مقدس منتر اور افتتاحیہ اشلوک بن چکا ہے جس کا جاپ کیے بغیر ہم اردو افسانے پر بات نہیں کرتے۔ گاندھی جی کی رام دھن کی طرح یہ ایک نوع کا TOTEM بن گیا ہے۔ لیکن اس کا جاپ کرتے وقت ہم یہ تذکرہ کرنا بالکل بھول جاتے ہیں کہ جو حالات کفن میں دکھائے گئے تھے آج کا عالم اس سے بدتر ہے۔

ستارہ کا "سنہرا خواب" کفن کی GENRE کا افسانہ ہے۔ کفن کے بعد ان گنت کہانیاں اس قسم کی لکھی گئیں جنھوں نے افسانے پڑھنے والی شہری مڈل کلاس کو جھنجھوڑا یا کم از کم متاثر کیا۔ چند سال بعد آزادی آئی۔ اس کے بعد کے منظر نامے سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ مزدور انتہائی سادگی سے مات کھا چکا ہے اور خواجگی دھوم دھام سے فتح کے شادیانے بجا رہی ہے۔ اور بیشتر ذہن پرست اور دانشور ایک اور طرح کی "سمجھوتہ ایکسپریس" پر سوار ہو چکے ہیں۔

ان معاملات پر افسانے لکھنا اب دقیانوسی بلکہ شرمناک سمجھا جاتا ہے۔ گویا سب مسائل حل ہو چکے۔ راوی چین لکھتا ہے۔

اور ستارہ جعفری جیسے آدرش وادی لوگ ہیں کہ وہی پرانا راگ الاپے جا رہے ہیں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ حق و باطل اور انصاف و بے انصافی کی معرکہ آرائی میں حق سے وابستگی بھی اب بڑی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں زندگی ارزاں ہے موت وافر۔ لوگ بھنگوں کی طرح جیتے اور مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا لیکن ستارہ جعفری کے ہاں مقصدیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے افسانوں کا اختتام ایک اخلاقی حکایت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

آج کل کی کلبیت پسند مطلب پرست خود غرض دنیا میں ستارہ جیسے نیک دل اور انسان دوست لوگ ذرا MISFIT سے معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے خوشی یہ ہے کہ ایسے لوگ کم از کم ابھی موجود تو ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ جگر صاحب نے ایسے ہی بندوں کی طرف سے کہا تھا ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

قرۃ العین حیدر

بمبئی ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء

نسرین جب سب مہمانوں کو رخصت کر کے کمرے میں آئی تو اس کی نگاہیں اپنے شوہر کی تصویر پر جا کر ٹھہر گئیں، وہ کہنے لگی مصیبت کے دنوں میں تمھاری تصویر دیکھ کر مجھے ذہنی سکون مل جایا کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا تم مجھ سے دور نہیں ہو بلکہ میرے ساتھ ہر دُکھ اور سُکھ کے ساتھی ہو تو آج اس خوشی کے موقعے پر بھی میں تمھارے پاس آئی ہوں۔ آج مجھے پوری کائنات مسکراتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ذرّہ ذرّہ خوشی سے ناچتا ہوا معلوم ہو رہا ہے اور ہر چیز پر بیساختہ پیار آرہا ہے۔ ایسے وقت میں اگر تم زندہ ہوتے تو میری مسرت میں اور اضافہ ہوجاتا۔ غم کا بوجھ تو تم سے دور رہ کر اور پھر تمھیں کھو کر بھی میں نے جھیل لیا تھا مگر آج میں اس خوشی کو تنہا نہیں برداشت کر سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا دل اس بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔

میں نے کبھی تم سے شکایت نہیں کی! تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ گئے میں نے اُف نہیں کی! لیکن آج کی خوشیاں گذشتہ سالوں کی ایک ایک بات دہرانے کو کہہ رہی ہیں۔ جاوید! تم میری کہانی سُن لو! تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس کہانی میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو تم جانتے ہو اور کچھ نئی سُناؤں گی۔ میری سب باتوں کو سن لینا۔

یاد ہے نا ؛ جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم ہورہی تھی۔ تم جیسا شوہر پاکر میں بھی اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ ابھی ہماری شادی ہوئے کچھ دن ہی گزرے تھے۔ ہمارے سہروں کے پھول بھی نہ مرجھائے تھے، میرے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی ہلکا نہیں ہوا تھا کہ تمھیں ہندستان سے دور لڑائی پر جانا پڑا۔ تم فوجی افسر تھے کس طرح انکار کر سکتے تھے۔

اور جب آخری رخصت کو تم میرے پاس آئے تھے تو تم نے کہا تھا: ہندستانی لڑکیاں حالات کا مقابلہ بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ کرتی ہیں۔ ہماری تاریخ گواہ ہے جب وطن پر کوئی نازک وقت آیا ہے تو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے سجاکر اپنے بیٹوں اور شوہر کو میدان جنگ میں بھیج دیا ہے۔ جھانسی کی رانی اور بیگم حضرت محل نے تو خود لڑائی لڑی ہے۔ آج تم بھی مجھے اسی بہادری کے ساتھ جانے کی اجازت دے دو؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ تمھیں خدا کے سپرد کر دیا تھا۔

تم مجھ سے ہزاروں میل دور چلے گئے تھے۔ میری راتیں اُجڑ گئی تھیں اور دن ویران ہوگئے تھے مگر میں بڑے صبر کے ساتھ تمھاری جدائی کو برداشت کررہی تھی اس آس پر کہ تم میری تمام خوشیاں لے کر واپس آؤگے۔ میں نے جو اُمید کی شمع جلائی تھی اُس کی روشنی میں اپنی زندگی کے یہ خشک اور بے کیف دن گزار رہی تھی۔ میں سوچتی ہوں اگر انسان کے پاس اُمید کا سہارا نہ ہو تو وہ ایک روز بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تمھارا محبت بھرا خط آتا تھا تب میری بے رنگ زندگی میں کچھ رنگینی پیدا ہو جاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے میرا مرجھایا ہوا دل شاداب ہو جاتا تھا۔

اللہ! جانے یہ کیسی دوری تھی جو ختم ہونے پر نہ آتی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اور دن مہینوں میں تبدیل ہوگئے۔ آخر وہ وقت آگیا جب میری گود میں تمھاری ننھی سی تصویر آگئی اور میرے آنچل میں ایک چاند مسکرانے لگا۔ اب مجھے تنہائی کا احساس کم ہوتا تھا کیوں کہ میرا زیادہ وقت بچے کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ لیکن ایک بات ہے اس ننھے سے خوبصورت کھلونے کو پانے کے بعد مجھے تمھاری یاد اور بھی زیادہ ستانے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ

تھی کہ تمھارا بیٹا بالکل تمھاری صورت تھا۔ کہتے ہیں۔ ماں کے خیالات کا اثر بچّے کی صورت پر پڑتا ہے تو ان دنوں میرے تو دل و دماغ پر ہر وقت تم ہی چھائے رہتے تھے۔

پھر کچھ دن بعد مجھے تمھارا خط ملا۔ تم نے لکھا تھا۔ مجھے تمھارے خط سے یہ معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہماری محبت کا پھول کھل گیا۔ نہ جانے یہ پھول میرے ہاتھوں میں کب آئے گا۔ میرا دل چاہتا ہے اُس کے لال لال تلوے میں اپنی آنکھوں سے لگا لوں، لیکن میرے اور اُس کے درمیان تو ہزاروں میل کا فاصلہ ہے یہ کیسی مجبوری ہے کہ ایک باپ اپنے پہلے بچّے کو پیار نہیں کر سکتا اب یہ تمھارا فرض ہے کہ جب تک میں واپس نہ آؤں ماں اور باپ دونوں کی محبت اس کو دینا۔

جب سے یہ خوشخبری ملی ہے۔ میرے مزاج میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ میرا مزاج جو چٹان کی طرح سخت تھا۔ اس میں پھولوں کی سی نرمی اور شبنم کی سی ٹھنڈک آگئی ہے۔ جب بندوق ہاتھ میں اٹھاتا ہوں تو فوراً کسی کی کومل شکل نظروں میں پھر جاتی ہے۔ اب مجھے چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی اچھی لگنے لگی ہیں۔ کل ہم لوگ بازار گئے تھے وہاں سے میں نے کچھ کھلونے خرید لیے ہیں اور وہ میری کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بات پر میرے ساتھیوں نے بہت مذاق اڑایا۔ وہ کہتے ہیں "کیا اب تم ہٹلر کو کھلونے دے کر بہلاؤ گے؟" میں نے کہا "تمھیں کیا خبر یہ کھلونے میرے دل کی تسکین کا سامان ہیں۔ ان ننھے ننھے گڈّوں میں مجھے اپنے گڈّے کی شباہت نظر آجاتی ہے"۔

میں نے بچّے کا نام اختر رکھ دیا ہے۔ امید ہے تم بھی پسند کرو گی؟ خدا کرے ہمارا بیٹا ہندستان کا تارا بن کر چمکے۔ اب کے خط میں تم اپنی اور اختر کی تصویر ضرور بھیجنا۔ دیکھو بھولنا نہیں۔

پھر ایک دن تمھارا تار ملا۔ تم کچھ دن کی چھٹی پر گھر آرہے تھے۔ تمھاری آمد کی خبر سے صرف میں ہی نہیں بلکہ گھر کے در و دیوار تک مسکرا رہے تھے۔ میں نے تمھارے استقبال کی بڑی شاندار تیاری کی تھی۔ تمام گھر پھولوں اور برقی قمقموں سے آراستہ کیا تھا۔ جب خیال آیا میں نے تمھاری جدائی کے یہ سال کیسے گزارے۔ اس وقت تو مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔

میں تمھیں لینے کو اسٹیشن گئی تھی۔ وہاں اور بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کو لینے آئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اور ہار تھے۔ میں بھی تمھارے لیے ایک خوبصورت سا ہار لے کر گئی تھی اور گلدستہ کی جگہ میری گود میں خود تمھارا ہی دیا پھول تھا۔

ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر آ رہی تھی اور میرے دل کی دھڑکن میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ٹرین رُک گئی اور مسافر اترنے لگے۔ کوئی پھول پہنا رہا تھا تو کوئی اپنے برسوں کے بچھڑے ہوئے پیاروں کے گلے مل رہا تھا۔ دوری ختم ہو رہی تھی اور فاصلے مٹ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ملٹری کا پورا ڈبا خالی ہو گیا مگر جاوید! تم نہیں اترے میرے ہاتھوں میں جو پھول کا ہار تھا وہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا اور اس کے ساتھ میری امید کی شمع بھی گل ہو گئی۔ میں پاگلوں کی طرح تمھیں ایک ایک کمپارٹمنٹ میں پکارتی پھر رہی تھی۔ ہر آنے والے سے پوچھ رہی تھی جاوید کیوں نہیں آئے۔ خدا کے لیے بتا دو وہ کہاں ہیں؟

اچانک کسی نے نرمی کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا: "یہ کاغذ لو اور صبر کرو جاوید لڑائی میں کام آ گیا۔ وہ اب کبھی ہندستان واپس نہیں آ سکتا۔"

میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی پھر نہیں معلوم میں کیسے گھر واپس آئی۔ تم جو اپنی نشانی دے گئے تھے اُسی کے سہارے میں زندگی کا یہ کٹھن سفر طے کر رہی تھی۔ سوچتی تھی اختر کے بڑے ہونے پر مجھے اپنی منزل مل جائے گی۔ تم نہیں جانتے جاوید! کہ بن باپ کے بچوں کو پالنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ بچہ تو ایسا پودا ہوتا ہے جس کی نگہداشت ماں اور باپ دونوں کرتے ہیں جب وہ سنورتا ہے۔ اس کے برعکس میں تنہا اپنے لال کو پال رہی تھی لیکن میں نے اختر کو کسی غلط راہ پر نہیں جانے دیا۔ تمھارا بیٹا تم ہی جیسا ہونہار ہے۔ اس کے لیے میں نے بڑے سخت دن دیکھے ہیں۔ میں خود بھوکی رہی ہوں مگر اختر کو بھوکا نہیں رکھا۔ تم سے سچ کہہ رہی ہوں جاوید! اپنی ضروریات پوری نہیں کرتی تھی مگر اس کو اعلا تعلیم دلا رہی تھی۔ میں سوچتی تھی۔ اگر آج تم زندہ ہوتے تو اس کی پرورش کتنے بہترین طریقے سے ہوتی۔

اختر میں اب کچھ سمجھ آ گئی تھی۔ میں نے ابھی تک تمھارے بارے میں اُس سے

کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بچپن سے ہی وہ اپنے کو یتیم سمجھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ بڑے ہونے پر تو پھر حقیقت کو کوئی بھی نہیں چھپا سکتا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے میری زبان سے وہ بات کہلوائی جو میں ابھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔ صبح کا وقت تھا وہ اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے کہا: آؤ بیٹا! ناشتہ کر لو۔"

"پہلے ابا کو بلائیے پھر میں آؤں گا۔"

بچے کی زبان سے آج یہ نئی بات سن کر تعجب بھی ہوا۔ اور میرے پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا: آؤ ناشتہ کر لو۔ ابا بھی آجائیں گے۔"

"سب بچے اپنے ابا اور امی کے ساتھ میں کھانا کھاتے ہیں۔ آپ مجھے اکیلا کیوں کھلاتی ہیں۔"

"کھالے میرے لال! تیری ماں تجھے سب کچھ دے سکتی ہے لیکن اس کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔"

"آپ نے کیوں میرے ابا کو چھپا دیا ہے؟ ان کو ابھی ابھی لائیے۔"

"کہاں سے لاؤں بیٹا! میں نے تو ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر تم ہو!"

"اسکول میں سب بچے چھیڑتے ہیں۔ تم اپنے ابا کو بھی نہیں جانتے؟" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔

آخر کے آنسو میری برداشت سے باہر ہو گئے۔ میں نے کہا: تیرے ابا اتنی دور چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میں نے سب کچھ تفصیل سے بتا کر تمہاری تصویر دکھادی۔

وہ تصویر دیکھ کر ہنس پڑا اور پھر بڑے شوق سے دیکھتے ہوئے پیار کرنے لگا۔ میں نے سوچا یہ دنیا کتنے عجیب و غریب واقعات سے پُر ہے۔ ابھی تک دیکھا تھا باپ اپنے بچوں کو پیار کرتے تھے۔ یہاں ایک معصوم بچہ اپنے مرحوم باپ کی تصویر کو چوم رہا تھا۔

ایسے نہ جانے کتنے غم جھیلنے کے بعد آج میرے لیے یہ خوشی کا وقت آیا ہے۔ ایک ہفتہ بعد میرا بیٹا چاند سی دلھن بیاہ لائے گا۔ کاش اس خوشی میں آج تم بھی شریک ہوتے اور اپنے بیٹے کا سہرا دیکھتے۔ لیکن میری قسمت میں ایسی خوشی کہاں تھی۔ تم تو میری زندگی

میں خوشبو کی طرح آئے تھے۔

"امی! میں کب سے آپ کے پاس کھڑا ہوں؟"

"کیا ہے میرے لال! تم کب آئے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں تیرے باپ کو تیری شادی کی خوشخبری سنا رہی تھی"

"شادی تو اب نہیں ہو سکتی۔ یہی میں آپ کو بتانے آیا ہوں"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں؟"

"امی! میں خود شادی کرنا نہیں چاہتا۔ ہمارے ہندستان پر جنگ کے بادل گھِر آئے ہیں۔ چین نے حملہ کر دیا ہے۔ بہت سے نوجوان سرحد کی حفاظت کے لیے جا رہے ہیں۔ ان جانے والوں میں میرا نام بھی ہے۔

"کیا تم بھی مجھے اپنے باپ کی طرح چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"نہیں امی! میں تو آپ جیسی ان گنت ماؤں کو لڑائی کے شعلوں سے بچانے جا رہا ہوں جس طرح اور سب نے اپنے بیٹے وطن کی خدمت کے لیے دے رہے ہیں اسی طرح آپ بھی مجھے جانے کی اجازت دے دیجیے؟"

"اگر تم اپنے ملک کی خدمت کے لیے جا رہے ہو تو پھر میں تمھیں نہیں روکوں گی۔ ایسی باتیں کر کے میں تمھاری ہمت کو پست نہیں کروں گی۔ میں بڑی خوشی سے اجازت دے رہی ہوں جاؤ اور مادرِ وطن کی حفاظت کرو لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اپنے باپ کی طرح وہاں رہ مت جانا۔ یہاں تمھاری ماں اور دلھن تمھاری واپسی کی راہ دیکھیں گی۔ اور جب تم کامیاب واپس آؤ گے تو میں زیور اور پھولوں میں سجا کر اپنی بہو کو لاؤں گی جب میرا آنگن چراغوں سے روشن ہو جائے گا۔

"میری امی! بچپن سے آپ نے میری ہر خواہش پوری کی ہے کیا آج میری ایک بات اور مانیں گی؟"

"ضرور بتاؤ بیٹا! میں تو تمھاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں!"

"میں چاہتا ہوں. آپ دلھن کا زیور نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دے دیں؟"

"کیا کہا! میں دلھن کا زیور بھی دے دوں؟"

"جی ہاں. امّی جان! اس وقت دلھن کو زیور سے سجانے سے زیادہ ہمارے ملک کو ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔"

"تو کیسی بات کر رہا ہے میرے لال! شادی کے زیور میں تو سہاگ کی نشانی ہوتی ہے وہ کیسے دے دوں؟"

"اگر ایک لڑکی کے سہاگ کی نشانی دینے سے بہت سی عورتوں کا سہاگ بچ جائے تو ضرور دے دینی چاہیے۔"

"یہ نہیں کہو بیٹا! میرے دل کو وہم آتا ہے. خدا کرے میری بہو کے ساتھ ہندستان کی سب عورتوں کا سہاگ قائم رہے. میں زیور دے دوں گی، میں نے اپنا شوہر دے دیا وطن کو بچانے کے لیے آج اپنے بیٹے کو بھیج رہی ہوں تو بہو کے سہاگ کی نشانی بھی دے دوں گی اور پروردگار سے دعا کروں گی کہ مادرِ وطن کی گود اور مانگ ہمیشہ بھری رہے.

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

۶ر ستمبر ۱۹۶۵ار

بوقت ۱۰ ربجے شب

آج شام کو سات بجے کے قریب میں فلم "حقیقت" دیکھ کر واپس آئی ہوں۔ اس میں لڑائی کا منظر دکھایا ہے اور ایک گانا ہے جو مجھے بے حد پسند آیا ہے

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو

اب تمھارے حوالے وطن ساتھیو

میں یہ آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی کہ اچانک کسی نے کہا "پاکستان نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔" میں چونک پڑی "نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"ہم نے آج شام کی خبروں میں سُنا ہے۔ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔"

مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے کانوں پر خود ہی اعتبار نہیں رہا۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سمجھا کیا پڑوسی پڑوسی پر یہ ظلم کر سکتا ہے؟ کیا بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹ سکتا ہے؟؟ نہیں یہ ناممکن ہے۔ لیکن رات ہوتے ہوتے حقیقت روزِ روشن کی طرح صاف ہو گئی۔

۷ر ستمبر ۱۹۶۵ار

آج صبح کے اخبار میں آ گیا لڑائی گھمسان کی ہو رہی ہے۔ نہ جانے کتنی ماؤں سے

اُن کے لال اور بہنوں سے بھائی بچھڑ گئے ہوں گے ؛ دوستی کے تمام بندھن ٹوٹ گئے ہیں۔ آمد و رفت کے راستے بند ہیں۔ دلوں کو تقسیم کرنے کے بعد یہ نیا ظلم تو نہ کیا ہوتا۔

۸ر ستمبر ۱۹۶۵ء

ابھی کچھ دن پہلے ہم نے آزادی کی سال گرہ منائی تھی جب پاکستان نے ہمیں محبت کے پھولوں کا تحفہ تو نہیں بھیجا تھا آج سنا ہے ہمارے لیے خوفناک قسم کے ٹینک اور ہوائی جہاز بھیجے ہیں۔ کاش وہ ہمارے ملک میں بھائی بن کر آتے اور ہم اُن کو محبت سے گلے لگاتے اُس وقت ہماری محبت پر پوری دنیا رشک کرتی مگر وہ تو غیروں کے بہکانے میں اپنوں کو بھول گئے۔

۹ر ستمبر ۱۹۶۵ء

ابھی صرف رات کے ۱۰ بجے ہیں لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ شہر میں مکمل بلیک آؤٹ ہے۔ اس وقت ہمارا یہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر بمبئی تاریکی کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ فلک بوس عمارتیں جو رات کے وقت جگنو کی مانند جھلملاتی تھیں اس وقت چاند کی مدّھم روشنی میں بے حد بھیانک لگ رہی ہیں۔ میرے چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اس خاموشی اور تاریکی کو چیرتی ہوئی ایک آواز کانوں سے ٹکراتی ہے : "لائٹ بند کرو"۔ میرے گھر کے سب لوگ بستروں میں لیٹ گئے ہیں لیکن میں ذہنی طور پر اس قدر تھک گئی ہوں کہ نیند بھی نہیں آرہی۔ میرے کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر سیاہ رنگ کے کاغذ چپکے ہوئے ہیں اور میں موم بتی کی روشنی میں اپنی ڈائری لکھ رہی ہوں۔

۱۰ر ستمبر ۱۹۶۵ء

آج صبح کے اخبار اور ریڈیو سے معلوم ہوا ہے اب لڑائی ہماری دوسری سرحدوں پر بھی پھیل گئی ہے۔ کشمیر کی وادی جو اس موسم میں پھل اور پھولوں سے بھر جاتی تھی۔ آج اُس کا آنچل پھل اور پھولوں کی بجائے گولیوں سے چھلنی ہو گیا ہے۔ لیکن اس سرزمین کو بچانے کے لیے ہمارے جوان اپنا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء

آج محاذِ جنگ سے میرے بھائی کا خط آیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے شعلوں کی آزمایش میں، میں اپنا فرض بڑی خوبی سے ادا کر رہا ہوں۔ آپ کی دعائیں اور خدا شاملِ حال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر یہ خدا کس کا ساتھ دے گا؟ پاکستان کے حکمرانوں کا جو خدا اور اسلام کا نام لے کر جنگ کے شعلے بھڑکا رہے ہیں یا اُن کا ساتھی ہوگا جو بے گناہ انسانوں کو بچانے کے لیے اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے جانوں پر کھیل رہے ہیں۔

۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء

گذشتہ دو دن بڑی مصروفیت میں گزرے۔ موجودہ حالت میں کام کرنے کے لیے ہم نے عورتوں کی ایک انجمن بنائی ہے۔ اس میں سب ہی مذہب و ملّت کی خواتین شامل ہیں۔ ہماری انجمن رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ معلوم ہوتی ہے۔ آج ہماری انجمن کی سب خواتین جوانوں کے لیے خون دینے گئی تھیں۔ مجھے یہاں آکر اندازہ ہوا سب کے دلوں میں کتنا جوش اور حبِ وطن ہے۔ مردوں اور عورتوں سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ یہاں رام چندر بھی خون دے رہا تھا اور محمد عباس بھی۔ فاطمہ بھی تھی اور سیتا بھی۔ خون کے اس ملاپ کو دیکھ کر میں سوچنے لگی۔ اتحاد کا اس سے بڑا ثبوت ہمیں کہیں نہیں مل سکتا۔ اگر سب لوگ اسی طرح اپنے دل و دماغ کو ملالیں تو یہ خون کی ہولی بند ہو جائے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

شب کے گیارہ بجے ہیں۔ آخری تاریخوں کا چاند ابھی تک نہیں نکلا۔ چاروں طرف رات کی سیاہ زلفیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس وقت شب کی تاریکی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ ابھی ایک گھنٹے قبل خطرے کا سائرن بجا تھا۔ بڑی عجیب بات ہے دل میں کسی قسم کا خوف پیدا نہیں ہوا بلکہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے دل میں نئی ہمت آگئی میں تمام وقت سوچتی رہی اپنے وطن کے بچانے کے لیے ہمیں کل آج سے بھی زیادہ کام کرنا ہے اور اپنی ایکتا کی طاقت کو مضبوط کر کے ان انگاروں کو بجھانا ہے جو ہمارے سروں پر برس رہے ہیں۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء: آج بہ حیثیت سوشل ورکر مجھے اسکول میں جا کر بچوں کو جنگ کے بارے

میں بتانا تھا جس وقت میں کلاس کے اندر گئی۔ اگلی صف میں سے ایک آٹھ، نو سال کا لڑکا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کہا: "اپنے وطن کی حفاظت کے لیے یہ دس روپے میں آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ آج میری ماں نے فٹ بال خریدنے کے لیے یہ پیسے دیے تھے مگر اب میں بال کی بجائے اس سے بم خریدوں گا۔"

میرا ہاتھ آگے بڑھا اور ذہن میں ایک مسکراتی ہوئی شکل اُبھری۔ پاکستان میں میرے بھی تو عزیز ہیں اور ایک بھانجا تو اسی بچے کا ہم عمر ہے۔ ابھی۔ چار پانچ ماہ قبل میں اپنی بھتیجی کی شادی میں وطن گئی تھی، وہاں وہ بھی آیا تھا اور دو۔ تین دن کے اندر واپس جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: "مجھے تمھارے آنے کا علم نہیں تھا۔ اس لیے میں اس وقت تمھیں کوئی تحفہ نہیں دے سکتی۔ بتاؤ وہاں میں تمھیں کیا چیز بھیجوں؟"

میرے سوال پر اس نے شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔ "اچھا میں تمھیں اپنے یہاں کی سلک کی قمیص بھیج دوں۔ پسند ہے؟"

"قمیص کا کپڑا تو امریکہ سے بھی بہت اچھا آتا ہے۔ آپ ہندستان کی بنی ہوئی کوئی خاص چیز دیجیے جو وہاں نہ ملتی ہو اور بہت دن تک میرے پاس رہے۔"

"اچھا۔ تم سوچ کر بتاؤ؟"

"آپ ہمیں چھوٹا سا تاج محل بھیج دیجیے۔ وہ ہمارے پاکستان میں نہیں ملتا۔ وہاں میں اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا کہ میری خالہ نے یہ خوبصورت تحفہ دیا ہے۔"

"یہ بے مثال محبت کی نشانی میں تمھیں ضرور دوں گی اس دعا کے ساتھ کہ ہند پاک میں بھی ایسی محبت قائم ہو جائے۔"

کتنی عجیب بات ہے۔ میں اس کو محبت کی نشانی تو نہیں بھیج سکی۔ آج ان پیاروں کے لیے گولا بارود خریدنے کے لیے پیسا جمع کر رہی ہوں۔ یہ بم ایوب شاہی کو ختم کرنے سے پہلے نہ جانے کتنی معصوم محبتوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ یک بارگی جیسے میرا دل کانپ گیا۔ میری آنکھوں میں دو پیاری پیاری شکلیں پھرنے لگیں۔ ایک اُس بھانجے کی جو اسی طرح کسی اسکول میں بیٹھا ہو گا۔ دوسری اُس بھائی کی جس نے اپنے ملک کو بچانے کے لیے جان کی

بازی لگا دی ہے۔ یہ چند منٹ بڑی کشمکش میں گزرے بچے مری شکل دیکھ رہے تھے اور میرے سامنے میز پر پیسوں کی ڈھیری لگی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا وطن کے لیے ہمیشہ جان اور مال کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہاں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی خاک میں ہمارے بزرگوں کی ہڈیاں پنہاں ہیں۔ اس مقدس سرزمین کو بچانا ہمارا فرض ہے اور فرض ہمیشہ محبت پر غالب آتا ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء

آج کل راتوں میں اس قدر اندھیرا رہتا ہے کہ کچھ لکھنا ناممکن ہے۔ لڑائی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہند پاک کی لڑائی نے پوری دنیا میں ہلچل مچادی ہے۔ یو۔ این۔ او۔ کے جنرل سکریٹری دونوں ملکوں کے درمیان صلح کرانے آئے تھے۔ وہ دونوں جگہ کا دورا کرکے واپس گئے۔ اب نتیجے کا انتظار ہے۔ ہماری حکومت جنگ بند کرنے کو تیار ہے۔ خدا پاکستان کو بھی سمجھ دے۔ آمین۔

۲۱ ستمبر ۱۹۶۵ء

آج بڑی اچھی خبر سنی ہے۔ کل ساڑھے بارہ بجے لڑائی بند ہو جائے گی۔ مجھے اس خبر سے ذہنی طور پر بڑا سکون ملا ہے۔ خدا کرے یہ جنگ کے شعلے ہمیشہ کے لیے بجھ جائیں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء

میں نے خوشی اور غم کو اتنا ملا ہوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج صبح ریڈیو نے جنگ بند ہونے کی خوشخبری سنائی۔ اور دس بجے تار سے معلوم ہوا لڑائی بند ہونے سے چند گھنٹے قبل میرا منھ بولا بھائی وطن پر نثار ہو گیا۔ میں تو اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ یہ جانے کی خبر کیسے آگئی۔ جدائی کے اس غم کو برداشت کرنے والی میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ بہت سی مائیں اور بہنیں ہیں۔ میں نے اپنا سر غم سے جھکنے نہیں دیا بلکہ فخر سے اونچا ہے کہ میرے بھائی نے اپنے خون سے آزادی کی لو تیز کر دی۔ میں نے اس کی جدائی کو اس یقین پر برداشت کر لیا ہے کہ ایک دن وہ امن کا پیغامبر بن کر واپس آئے گا۔ کہتے ہیں شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے اور وہ رنگ دونوں ملکوں پر امن اور شانتی کی گھٹا بن کر چھا جائے گا۔ جب امن کے روپ میں مجھے اپنا کھویا ہوا بھائی واپس مل جائے گا تب میں لڑائی کے ان اٹھارہ دنوں کو بھول جاؤں گی۔

دردِ دل

یادیں خوبصورت بھی ہوتی ہیں اور انتہائی اذیت ناک بھی. یادوں کے گہرے سمندر میں ڈوب ڈوب کر اُبھرنے اور اُبھر اُبھر کے ڈوبنے میں انسان کو عجیب لطف آتا ہے. کبھی تو یہ قوس قزح کی طرح رنگین معلوم ہوتی ہیں اور کبھی ان میں بجلی کی سی تڑپ ہوتی ہے.

یہ وہ بیش بہا دولت ہے جس میں عمر کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے. آج میری یادوں کے اُفق پر قدسیہ کی پیاری شکل اُبھر رہی ہے. قدسیہ میری بچپن کی دوست، میری یادوں کی شہزادی. مجھے تقسیم ہند سے پہلے کا وقت یاد آرہا ہے. مشرقی یو.پی میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں ہم دونوں پیدا ہوئے. ہمارے گھر برابر تھے. اس لیے ہر وقت کا ساتھ تھا. میں دس بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور قدسیہ کے ایک بڑا بھائی تھا جو عمر میں اُس سے دس گیارہ سال بڑا تھا وہ دہرہ دون اسکول میں پڑھتا تھا. اس لیے گھر میں والدین کی توجہ کا تنہا مرکز قدسیہ تھی. اس بے انتہا محبت اور چاہت نے اُسے بے حد ضدی بنا دیا تھا. جذباتی تو وہ فطرتاً تھی. مجھے آج بھی یاد ہے. ہماری عمریں سات آٹھ سال کے درمیان ہوں گی. میری بڑی بہن کی شادی ہوئی اُسے دیکھ کر ہم دونوں نے بھی اپنے گڈے اور گڑیا کی شادی طے کرنی. اس شادی میں ہمارے بزرگوں نے بھی کافی دلچسپی لی تھی. باقاعدہ بری، جہیز کے جوڑے تیار ہوئے تھے. سُنار سے چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور بنوائے گئے تھے، حلوائی نے دولھن کے گھر لے جانے کے لیے ننھی منی گلاب جامن اور دوسری مٹھائیاں بنائیں اور ہم دھوم دھام سے بارات لے کر

قدسیہ کے گھر گئی۔ جب دولھن کو رخصت کرانے کا وقت آیا تو قدسیہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور کہا:

"دیکھو۔ میری گڑیا کو بہت آرام سے رکھنا، مارنا نہیں!"

مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے کہا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

اسی وقت قدسیہ کی پھوپی اپنے بھائی سے مخاطب ہوئیں۔ "بھیا! اس سچ مچ کی گڑیا کو تو میں دُلھن بنا کر لے جاوں گی!"

پھر اپنے بیٹے نوید سے کہا: "دیکھو تمھاری دُلھن کتنی پیاری ہے!" قدسیہ کی پھوپی زاد بہن شمسہ نے آگے بڑھ کر قدسیہ کی پیشانی چوم لی۔ "میری چھوٹی سی بھابی۔" قدسیہ روتے روتے ہنس پڑی۔ اُس وقت شادی بیاہ ہمارے لیے ایک تماشے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ عمر اور وقت کے ساتھ ہماری محبت میں اور بھی پختگی آتی چلی گئی۔ ہم ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ ایک اسکول میں پڑھتے تھے اور سمجھتے تھے جیسے ساری زندگی یہ ساتھ رہے گا۔ آج بمبئی جیسے شہر میں رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے شہروں کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے قصبوں میں دوستی اور محبت زیادہ پائدار اور خوشیاں لامحدود ہوتی ہیں۔ ہمیں اپنی یہ چھوٹی سی دنیا مسرت و انبساط کا گہوارہ معلوم ہوتی تھی۔ ہم دونوں کے خاندان کافی بڑے اور بے حد مذہبی تھے۔ ان میں آئے دن مجالس، میلاد اور بچوں کی سالگرہ کی تقریبات ہوتی رہتی تھیں۔ قدسیہ کو خدا نے صورت کے ساتھ میٹھی اور سُریلی آواز سے بھی نوازا تھا۔ کوئی مجلس اور میلاد اُس کے بغیر شروع نہ ہوتی تھی۔ شبِ عاشور سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس اپنے لمبے لمبے گھنے بال کھول کر عزاخانے میں عَلَموں کے سامنے جب وہ یہ نوحہ پڑھتی تھی۔

شبِ عاشور بھائی کو بلا میں دیکھ کر زینب
تصدق کے لیے اے مومنو لائیں پسر زینب

تو سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور تیرہ رجب کی میلاد میں جب یہ قصیدہ شروع کرتی۔

آج گھٹا کیا جھوم کے اُٹھی
کعبہ کا پردہ جھوم کے اُٹھی

اُس وقت پوری محفل جھوم جاتی تھی اور واہ! واہ! کے شور کے ساتھ اس پر گلاب اور موتیا کے پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ اس زمانے میں ہمارے قصبے میں کوئی سنیما ہاؤس نہیں تھا۔ اس لیے اسکول کے علاوہ ہماری تمام تر دلچسپیاں انھیں کاموں کے لیے وقف تھیں۔

گرمیوں کا موسم ہمارے لیے نئی بہاریں اور خوشیاں لے کر آتا تھا۔ دوسرے شہروں میں رہنے والے ہمارے رشتے کے بھائی بہن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے یہاں آجاتے تھے قدسیہ کی پھوپی جان بھی نوید اور شمسہ باجی کو لے کر ہر سال آتی تھیں۔ شمسہ باجی مجھ سے اور قدسیہ سے عمر میں بڑی تھیں لیکن برتاؤ بالکل برابر والوں کا سا رکھتی تھیں۔ اس لیے میں اور قدسیہ اُن سے بہت بے تکلف تھے۔ قدسیہ کی پھوپی جان ہمیشہ اپنے ساتھ بہت سارے تحفے لے کر آتی تھیں اور اُن میں میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی تحفہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ بہت شوق سے ایک ایک چیز دیکھتے۔ شمسہ باجی بلند آواز میں اعلان کرتیں۔

"پہلے میری بھابی پسند کرے پھر کسی اور کو ملے گا۔" اس کے بعد کوئی چیز اس کے سامنے رکھ دیتیں "یہ لو نوید کا تحفہ تمھارے لیے ہے۔" قدسیہ شرماتی، پھوپی جان اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھ کر کہتیں "اللہ! تمھاری یہ خوشیاں ہمیشہ قائم رکھے!" اور نوید دزدیدہ نگاہوں سے قدسیہ کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔ قدسیہ کی نظریں بارِ حیا سے جھک جاتیں۔ ان دو مہینوں میں روز نئے نئے پروگرام بنتے۔ کبھی ہم سب بھائی بہن مل کر پکنک پر جاتے۔ بیڈمنٹن اور کیرم کھیلتے، چاندنی راتوں میں کھلی چھت پر ساری رات بیت بازی ہوتی۔ نوید ہر کھیل میں قدسیہ کا پارٹنر رہتا۔ وہ بے حد ذہین اور تیز تھا۔ جس وقت پارٹنر چننے کا وقت آتا وہ مسکرا کر کہتا "بھئی، قدسیہ کو میں ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ تو میری جنم جنم کی ساتھی ہیں۔" میرے بھائی جو قدسیہ کے خاموش پرستاروں میں تھے وہ اس جملے کو سن کر اُداس ہو جاتے۔

جب چھٹیاں گزر جاتیں اور سب لوگ آیندہ سال ملنے کے وعدے پر رخصت ہو جاتے تب ہماری ملاقات کا ذریعہ خط و کتابت ہوتی تھی۔ جس دن شمسہ باجی کا خط آتا تھا میں قدسیہ کو دیکھتے ہی سمجھ جاتی تھی۔ اُس کا خوبصورت چہرہ خوشی سے گلابی ہوتا اور کلاس میں اس کا دل نہ لگتا۔ جیسے خالی پیریڈ ملتا ہم دونوں دوسری لڑکیوں کی نظروں سے دور کسی گوشے میں درختوں

کی چھاؤں میں جا بیٹھتے اور مزے لے کر خط پڑھتے۔ اُس میں نوید کی طرف سے محبت بھرے اشارے کنائے ہوتے۔ آخر میں شمسہ باجی لکھتیں: "اماں کے ڈر سے وہ تمھیں خط لکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لیے اس خط کو تم نوید کا خط سمجھو۔"

ہم دونوں نے میٹرک کا اور نوید نے انجینیرنگ کا امتحان دیا۔ اس سال گرمیوں میں جب پھوپی جان آئیں تو انھوں نے قدسیہ اور نوید کی بات پکّی کر لی پھر اچھا دن تاریخ دیکھ کر منگنی کی رسم بھی ادا ہو گئی۔ پھوپی جان منگنی میں گلابی رنگ کا کارچوبی جوڑا اور انگوٹھی لائی تھیں۔ شمسہ باجی نے دلھن کا منھ دیکھ کر دل کی شکل کا سونے کا لاکٹ پہنایا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی سی نوید کی تصویر لگی تھی۔ انھوں نے چپکے سے قدسیہ کے کان میں کہا: "یہ تحفہ میرے بھیا کی طرف سے ہے۔"

جانے سے پہلے پھوپی جان نے اپنے بھائی سے ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء شادی کی تاریخ طے کر لی۔ دونوں طرف زور شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہم دونوں کو تو جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نئے نئے ڈیزائن کے جوڑے اور زیور بن رہے تھے۔ قدسیہ کے والدین نہایت فراخ دلی سے بیٹی کا جہیز تیار کرنے میں مصروف تھے۔

انھیں ہنگاموں میں ہندستان کی آزادی اور پاکستان کے عالمِ وجود میں آنے کی خوشخبری سنی۔ وطن کی آزادی اور نئے ملک بننے کی خوشیاں خون کی ہولی کھیل کر منائی گئیں۔ جان کے خوف سے دونوں طرف کے لوگ ہجرت کرنے لگے۔ اسی افراتفری میں قدسیہ کی پھوپی جان دہلی سے کراچی پہنچ گئیں۔ قدسیہ کا بڑا بھائی لاہور میں کام کرتا تھا وہ اُدھر ہی رہ گیا۔ کچھ پتا نہ تھا کہ کون کہاں ہے؛ ڈاک، تار سب بند تھے۔ صرف بے گناہوں کا خون تھا جو چاروں طرف رواں دواں تھا۔ مہینوں بعد کسی عزیز کا خط آ جاتا تھا تو اُسے پورا خاندان ایک گھر میں جمع ہو کر مرثیہ کی طرح سنتا تھا اور درحقیقت وہ مرثیہ ہوتا بھی تھا۔ اُس میں کسی کی موت اور کسی کے گھر لٹنے کی خبر ہوتی تھی۔ جو گھر برسوں میں بسائے گئے تھے وہ منٹوں میں اُجڑ گئے۔ ایک دن قدسیہ کے چچا اور چچی کی خبر بھی آ گئی۔ قدسیہ کے والد اس المناک سانحہ کو برداشت نہ کر سکے۔ خط پڑھ کر جو آنکھیں بند کیں تو پھر نہ کھلیں۔ اس کے بائیس دن بعد قدسیہ کی امّی جان بھی قدسیہ کو اس بے رحم دنیا میں تنہا چھوڑ گئیں۔ اللہ! کیا ہولناک وقت تھا۔ پے در پے صدموں اور پریشانیوں نے آنکھوں کے آنسو خشک

کر دیے تھے۔ چالیسویں کے بعد ابّا جان اُسے اپنے گھر لے آئے۔ ہر وقت ہنستی کھیلتی قدسیہ اب پتھر کی مورت بن گئی تھی۔ وہ شوخیاں اور قہقہے والدین کے ساتھ دفن ہو گئے۔ کبھی کبھی پھوپی جان کا پوسٹ کارڈ آ جاتا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا تھا وہ بہت تکلیف میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ہر خط میں لکھتی تھیں۔ ہم لوگوں کو ابھی تک گھر نہیں ملا۔ جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ نوید بھی ملازمت کی تلاش میں ہے۔ جو کچھ اپنے پاس تھا اُسی کو فروخت کر کے گزر بسر ہو رہی ہے۔ سُنا ہے حکومت جلدی مہاجرین کو گھر دینے والی ہے لیکن ہمارا نمبر کب آئے گا یہ ابھی معلوم نہیں ہے۔ یہاں تو انسانوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا ہوا ہے۔ گھر مل جائے تو میں قدسیہ کو بہو بنا کر لے آؤں۔ آپ میری امانت کا ہر طرح سے خیال رکھیے گا۔ ہاں ایک بات اور لکھ رہی ہوں۔ آپ لوگ بھی یہاں آ جایئے بہت اطمینان ہے۔ ابّا جان ان خطوط کا تسلی بخش جواب لکھ دیا کرتے تھے۔

ایک دن اچانک قدسیہ کے لینے کو اُس کا بھائی آ گیا۔ انھوں نے بتایا۔ پھوپی جان کہتی ہیں اس بڑھاپے میں میرے لیے دور دراز کا سفر کرنا مشکل ہے۔ تم بہن کو یہاں لے آؤ تو میں اپنی آرزو پوری کر لوں۔ حالانکہ ابّا جان کی خواہش قدسیہ کو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی تھی لیکن بھائی اور پھوپی کے سامنے مجبور ہو گئے۔ امّی، ابّا جان نے اس کے جہیز کا سامان اور اَن گنت دعاؤں کے ساتھ قدسیہ کو رخصت کر دیا اور میں اپنے تصور میں اُسے دُلھن بنا ہوا دیکھتی رہی۔

ہندستان کے سینے پر جو خون کی لکیر کھینچی تھی وہ اب آہنی دیواروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے آمد و رفت ناممکن تھی۔ ہم بھائی بہن بھی رفتہ رفتہ موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ بس وقت تھا جو ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا تھا۔

پچیس سال بعد میں کراچی جا رہی تھی۔ وہاں میرے بھانجے کی شادی ہو رہی تھی۔ میری بہن کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی انھوں نے بے حد اصرار کے ساتھ بلایا تھا اور میں بھی شرکت کے لیے بے قرار تھی۔ جب ہوائی جہاز میں یہ اعلان ہوا کہ ہم کراچی ایرپورٹ پہنچ رہے ہیں۔ اس آواز کو سنتے ہی میری آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو آ گئے۔ نئے ملک کو دیکھنے اور بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کے خیال سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے کھڑکی میں سے نیچے دیکھا۔ شہر کے گھر گڑیا کے گھروندے کی مانند چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ نہ معلوم ان میں

سے کون سا گھر میرے بھائی بہنوں کا ہوگا۔ میرے خدا! پچیس سال! ایک صدی کا چوتھائی حصہ گزرنے کے بعد میں اپنے چاہنے والے بھائی بہنوں اور دوستوں سے ملوں گی۔ یہ وہ تھے جن سے ایک پل جدائی بھی شاق تھی۔ کچھ صورتیں دھندلا گئیں تھیں اور کچھ نقش ابھر رہے تھے اور انھیں میں میری عزیز ترین دوست قدسیہ تھی۔ نہ جانے پچیس سال میں وہ کیسی ہوگئی ہوگی؟ مجھے لینے وہ اور نوید ضرور آئے ہوں گے؛ ایرپورٹ پر سارے عزیز ملے لیکن قدسیہ کو نگاہیں ڈھونڈتی رہیں۔ میں نے آپا سے پوچھا:

"کیا قدسیہ کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے؟"

"معلوم تو ہے۔ تمھیں گھر پر ملے گی۔"

جب میں گھر پہنچی تو شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ دالان میں نو عمر لڑکیاں ڈھولک پر شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ بہت سے مہمانوں میں گھری ہوئی میں ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بیبیاں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور کمرہ فلک شگاف قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اسی وقت ایک خاتون آپا کے قریب آئیں: "لو مٹھائی لو۔ بیٹے کی شادی مبارک ہو! شادی کے گھر میں خالی ہاتھ نہیں آتے۔ آپ کے بہنوئی نے کہا مٹھائی لے کر جانا!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تقریباً پچاس سال کی عمر کی ایک صاحبہ کھڑی تھیں۔ سیاہ برقعہ پہنے اس میں سے سرخ رنگ کا گوٹا لگا ہوا دوپٹا چمک رہا تھا۔ مہندی رچے بھرے بھرے ہاتھ سرخ رنگ کی چوڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ رخساروں پر روپے کے برابر کالی چھائیاں پڑی ہوئی تھیں اور سر کے بال دھنی ہوئی روئی کی طرح سفید تھے۔

"ہائے اللہ! کیسی گرمی ہے!" یہ کہتے ہوئے انھوں نے برقعہ اتار دیا۔ چاندی کے لمبے لمبے تار کمر سے نیچے لٹکنے لگے۔

"گرمی سے حلق سوکھا جا رہا ہے! اے لڑکیو شربت پلاؤ۔ کیا ہی ہی کر رہی ہو؟" میری بہن سے مخاطب ہوئیں: "کچھ چائے شربت کا بھی انتظام کیا ہے؛ یا ویسے ہی بیٹے کی شادی رچانے بیٹھ گئیں؟"

میں انھیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میری بھابی نے جھک کر میرے کان میں کہا:

"یہ قدسیہ خالہ ہیں۔ آپ نے پہچانا نہیں؟"

"قدسیہ! ارے یہ میری قدسیہ ہے؟" میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں اٹھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اسی گرم جوشی سے اُس نے بھی گلے لگا لیا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے تھے۔ خوشی کے جذبات آنسو بن کر بہہ رہے تھے اور آواز حلق میں رندھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔

"قدسیہ! کیا حال بنالیا؟ میں نے تو پہچانا بھی نہیں؟"

"اے واہ! تم نے نہیں پہچانا تو کیا ہوا۔ ہم نے تو ایک نظر میں پہچان لیا تھا لیکن تمھاری محبت کا امتحان لے رہے تھے۔"

یہ حواس اور بدحواسی کی باتیں سن کر میرے تو ہوش اُڑے جا رہے تھے۔

"جاؤ بی بی! غسل خانے میں ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ میں شربت منگواتی ہوں۔" آپا نے کہا۔

"ہم تو گھر سے ہاتھ منہ دھو کر میک اپ کرکے آئے ہیں۔ ہمارے لال کپڑوں کا وہ مذاق اُڑا رہے تھے۔ ہم نے جواب دیا۔ واہ ہم تو اپنا شوق ضرور پورا کریں گے۔ ہمارے بھانجے کی شادی ہے۔" اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

میں نے پوچھا "نوید کہاں ہیں؟ کیا مجھ سے شرما رہے ہیں؟"

جواب دینے کی بجائے وہ خود ہی شرما گئی اور اپنی انگلی دل پر رکھ کر کہا "یہاں!" دل کی شکل کا لاکٹ سینے پر مچل رہا تھا۔ آپا نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میرا تو دم گھٹنے لگا۔

اسی وقت شور مچا دلہن کے گھر سے دولھا کا جوڑا آیا ہے۔ ہم سب بھاگ کر ہال میں آئے۔ وہاں بھی قدسیہ اپنے لال جوڑے اور میاں کے مذاق اُڑانے کا قصہ سنا رہی تھی۔ بیبیاں کہہ رہی تھیں "پھر تم نے اپنے شوہر کی پسند کے کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

"کیوں پہنتی۔ کیا ہماری کوئی پسند نہیں ہے۔ اب تو ہم جو چاہیں گے وہ کریں گے۔"

آپا نے پھر ٹوکا "قدسیہ! بھانجے کو دولھا بنانے کی تیاری کرو۔ یہ قصہ چھوڑو۔"

اِدھر لڑکیوں نے ڈھولک پر گیت چھیڑ دیا۔

میرا ہریالا بنا آ بیٹھا مسند کے بیچ

بنے میں کیا بلائیں لوں، کیا تیرے جوڑے کی

جوڑا تجھے ساج رہا، ہم رہے ارمانوں کے بیچ

میرا ہریالا بنا......

....

بنے میں کیا بلائیں لوں، کیا تیرے سہرے کی

سہرا تجھے ساج رہا، ہم رہے ارمانوں کے بیچ

تین چار دن شادی کے ہنگاموں میں گزرے وہ ہر جگہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی لیکن کچھ بے چین اور پریشان سی مگر شام ہوتے ہی اُس میں ایک عجیب سی تبدیلی آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے رات کی تاریکی اُس کی بے چینی کو سکون میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی نہاتی اور اپنے لمبے سفید بالوں کو سنوار کران کا خوبصورت سا جوڑا بناتی اور اس کو پلاسٹک کے پھولوں سے سجاتی۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر اور رخساروں پر غازہ ہوتا نہ جانے کن امیدوں کی کرنوں کا ہالہ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تھوڑا نکھار پیدا کر دیتا۔ دلھن کی طرح سولہ سنگھار کر کے وہ میرے کمرے میں آتی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگتی اور خاموشی سے بستر پر لیٹ کر سو جاتی۔

رات کسی کی تمناؤں کو جگاتی اور کسی کی آرزوؤں کو کچلتی آہستہ آہستہ گزر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن تھکے ہوئے ستاروں کو سلا دیتی۔ تب اُس کے سفید لمبے بال کھل کر بکھر جاتے۔ آنکھوں کا کاجل اُڑ جاتا اور ان میں سرخ ڈورے تیرنے لگتے۔ اُس کا رنگ صبح کے چاند کی مانند پھیکا پڑ جاتا اور رخساروں پر آنکھوں سے برسے ہوئے موتیوں کی چمک ہوتی۔ وہ سارا دن کھوئی کھوئی رہتی یا نوید کا ذکر کرتی رہتی۔ میں نے پوچھا:

"جب تمھیں نوید کی جدائی ایک ہفتہ بھی برداشت نہیں تھی تو اکیلی کیوں آئیں؟"

جواب کو ٹال جاتی۔ شادی میں آئے ہوئے مہمان ابھی رخصت نہیں ہوئے کہ اچانک قدسیہ نے باہر سے آکر کہا۔

"لو بھئی! ہم تو چلے"

"کہاں چلیں؟ ابھی تو دل بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔ ایک دوسرے کا حال احوال بھی نہیں پوچھا۔ یاد ہے پچیس سال کے بچھڑے ہوئے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمھارے لیے ہم اپنے بھائی کو چھوڑ دیں۔ ہمارے بھائی جان کا بہت اچھی جگہ تبادلہ ہو گیا ہے وہاں پھول ہی پھول ہیں"

"پھول تو تمھیں بچپن سے پسند ہیں۔ یاد ہے قدسیہ! جب دادی اماں ہمیں جوڑے پر پھول لگانے پر ڈانٹا کرتی تھیں"

قدسیہ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی سے سامان سمیٹا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

"ٹھہرو بی بی! میں کسی سے ٹیکسی منگوا دوں" آپا نے کہا۔

"ٹیکسی تو آپ منگوا دیں گی لیکن کرایہ کون دے گا؟"

"میں دوں گی!"

لیکن وہ اپنا سامان بغل میں دبا کر بغیر سلام دعا کیے رخصت ہو چکی تھی۔ آپا نے کہا۔

"بچاری کا آخری سہارا صرف بھائی ہے۔ اگر دیر ہوتی تو بھاوج چھوڑ جاتی"

"کیوں؟ اس کا اپنا گھر بھی تو ہے؟"

"شادی کہاں ہوئی غریب کی!"

"ارے؟ نوید سے شادی نہیں ہوئی کیا؟"

"نوید کیا کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ بس اپنے گھر اور شوہر کے قصے سناتی رہتی ہے"

"یہ تو میں پہلے ہی دن سمجھ گئی تھی کہ دماغ میں کچھ فتور آ گیا ہے لیکن بالکل ہی حواس کھو گئے یہ آج معلوم ہوا۔"

"شمسہ نے بچاری کو تباہ کر دیا؟"

"لیکن قدسیہ کا بھائی تو ہندستان سے یہ کہہ کر لایا تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر شادی ہو جائے گی۔

"معلوم ہے بی بی! آج کل جہیز کی ہوس بہت بڑھ گئی ہے۔ لڑکا جتنا قابل ہے وہ اتنا ہی بڑا جہیز مانگتا ہے۔"

"قدسیہ کے جہیز کا زیور، کپڑا تو ابا جان نے یہاں آتے وقت دے دیا تھا۔" اس سامان کی شمسہ کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہ تھی کیوں کہ نوید ایک کمپنی میں انجینیئر ہو گیا تھا اور جمشید روڈ پر ایک، عالیشان کوٹھی مل گئی تھی۔ قدسیہ کا بھائی کریم آباد کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ شادی کی پوری تیاری ہو گئی تھی۔ جس دن قدسیہ کو مایوں بٹھایا گیا اس شام شمسہ نے کہلوایا کہ اگر جہیز میں کار، ریڈیو وغیرہ دوگے تو ہم شادی کر سکتے ہیں ورنہ تم جہاں چاہو قدسیہ کی شادی کر دو۔ قدسیہ کے بھائی نے مجھ سے کہا "للہ آپ اس معاملے کو طے کرا دیجیے۔ یہ چیزیں دینا میرے بس سے باہر ہیں۔"

یہ سن کر میں پھوپی جان کے پاس جمشید روڈ گئی۔ میں نے کہا "آپ بزرگ ہیں اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی کو تباہی اور بدنامی سے بچا لیجیے۔"

پھوپی جان تو خاموش رہیں۔ شمسہ نے کہا۔ "وہ مرحوم بھائی کا وقت گزر گیا۔ ہمیں تو دنیا میں آگے بڑھنا ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے بھائی کی حسب حیثیت لڑکی تلاش کر لی ہے تاکہ نوید کو دوستوں کے آگے شرمندگی نہ ہو کر غریب لڑکی بیاہ لائے۔ کراچی میں بہت لڑکے ہیں کسی سے بھی قدسیہ کی شادی کر دیجیے۔ ہاں پیسے سے جو کچھ مدد ہو سکے گی وہ ہم کر دیں گے۔"

مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ "تم خاموش رہو شمسہ! میں پھوپی جان سے بات کر رہی ہوں۔" تب پھوپی جان بولیں "قدسیہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور میرے مرحوم بھائی کی نشانی کیا بلکہ عزت ہے ضرور لیکن جوان اولاد کی رائے کے سامنے میں مجبور ہوں۔"

"میری بھی جوان اولاد ہے لیکن مجال ہے جو میری مرضی کے خلاف کوئی کام کر جائے۔ یہ کہیے کہ آپ دولت کے سامنے جھک گئی ہیں۔"

"تو پھر اپنے لائق بیٹے سے قدسیہ کا نکاح کیوں نہیں کر لیتیں۔" شمسہ نے طنزیہ یہ جملہ بلند قہقہہ لگا کر کہا۔

میری جان جل گئی۔ "ضرور کروں گی۔ لیکن یاد رکھو شمسہ! کسی معصوم کا دل توڑ کر تم

اس ایرکنڈیشنڈ کوٹھی میں خوش نہ رہو گی! اس کی آہ کی ٹھنڈک تمھیں بھی ٹھنڈا کر دے گی!"

گھر واپس آکر میں نے اپنے بیٹے کا پیغام قدسیہ کے لیے دے دیا اور اس کے بھائی سے کہا "میں انھیں تاریخوں میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ مجھے جہیز نہیں صرف لڑکی چاہیے" لیکن جب لڑکیوں نے قدسیہ سے رائے لی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا "جہاں بچپن کی منگنی تھی شادی تو وہاں ہوگئی۔ دیکھو برسوں سے یہ تصویر میرے دل میں بسی ہوئی ہے" اور لاکٹ کھول کر سب کو نوید کی تصویر دکھائی پھر مانجھے کے کمرے سے نکل کر نہائی اور جہیز کے کپڑوں میں سے نکال کر سرخ رنگ کا جوڑا پہن لیا۔ جب سے یہ صرف سرخ اور گلابی رنگ کے کپڑے پہنتی ہے۔

"رحم وکرم کی پتلی شمسہ باجی اتنی زر پرست نکلیں تو نوید کی محبت کہاں مرگئی تھی؟"

"بی بی! دولت کی محبت ہر محبت پر غالب آتی ہے!"

"لیکن بچپن کے نقش تو بے حد گہرے ہوتے ہیں؟"

"نوید نے اُن کو مٹا دیا۔" آپا نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"بڑا ہی عبرت ناک واقعہ ہے۔ سچ چاندی کی چمک خون کے رشتوں کو بھی مٹا دیتی ہے۔"

پندرہ یوم کے بعد میں اپنے وطن واپس آگئی۔ آج کئی برس بعد ہوائے دوش پر ایک خط میرے پاس آیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوا قدسیہ ایک حادثہ کا شکار ہو گئی۔ میں نے سوچا وہ کون سا حادثہ تھا جس نے جان لے لی۔ اس کی تو پوری زندگی حادثہ تھی۔ لیکن اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ قسمت نے ملنے کے بعد بھی اُس سے کوئی بات نہ کرنے دی۔ دل کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں اور اللہ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ یہ موت ہمارے لیے تو سوہانِ روح ہے لیکن اُس کے لیے سکون ہے ابدی سکون! کتنے دکھ اُٹھائے اور کس خاموشی سے آغوشِ لحد میں جا سوئی۔

دردِ دل تھم گیا نیند آگئی دیوانی کو

بھائی بھائی

وہ لندن کی کہرآلودہ شام تھی۔ ہم ہندستانی طالب علم پکچر دیکھنے کے سلسلے میں ایک ہال میں جمع تھے۔ دفعتاً کسی نے "ہلو! ستیش!" کہہ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ میجر رحمان میرے سامنے کھڑے تھے۔

"ارے تم یہاں کہاں سے آگئے؟" میں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہاں آنے کا صرف تمھیں کو حق حاصل ہے؟" وہ زیرِ لب مسکرایا۔

"کم از کم مجھے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی؟ میں ایرپورٹ لینے آتا۔"

وہ حسبِ عادت خاموش ہوگیا۔

"تمھاری یہ پُرانی عادت گئی نہیں ہے؟ بھلے آدمی دوسرے ملک میں تو بولنا سیکھ لو!"

"چھٹیاں گزارنے!"

"کہاں ٹھہرے ہو؟ وہ رقیبِ روسیاہ کون ہے جس نے میرے دوست کو چھین لیا ہے؟"

"ہوٹل"! اس نے پھر مختصر جواب دیا۔

"دوست! تم سے مل کر اب پکچر دیکھنے کا موڈ نہیں رہا۔ چلو پہلے ہوٹل جائیں گے وہاں سے تمھارا سامان لے کر میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ میں جہاں رہتا ہوں

وہاں زیادہ تر ہندستانی طالب علم ہیں۔ میں اس اجنبی شہر میں تمھیں تنہائی اور بوریت کا احساس بالکل نہیں ہونے دوں گا۔ ہوٹل میں تو بیٹھے اونگھا کرو گے۔"

"ہاں کسی کسی وقت تو عجیب قسم کی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ ویسے تو زیادہ وقت گھومنے پھرنے میں گزر جاتا ہے۔"

"تم نے آخر مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟" میں نے اپنا جملہ پھر دہرایا۔

گھر سے روانہ ہوتے وقت وہ نوٹ بک بھول آیا جس میں تمھارا نیا پتا درج تھا آج یہاں اسی خیال سے آیا تھا کہ شاید تمھارا پتا لگ جائے۔ پتا کیا تم خود ہی مل گئے۔"

"اچھا تو اب چلتے ہیں۔" میں نے ٹیکسی لی۔ پہلے ہوٹل سے رحمان کا سامان لیا پھر اپنے کمرے میں آیا۔ آج میں بہت خوش تھا۔ پردیس میں اپنا دوست مل جائے تو اس خوشی کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو اپنے وطن سے دور ہو۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اب اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ خانہ داری کا کام بھی بخوبی انجام دے لیتا تھا۔ پہلے میں نے رحمان کے لیے کافی بنائی پھر کھانا تیار کیا۔ کھانے کے بعد پوری رات ہم نے گپ شپ میں گزار دی۔ میں نے لندن میں جو ایک سال گزارا تھا اور جو نئے نئے تجربے یہاں ہوئے تھے وہ سب سنا ڈالے لیکن رحمان ہاں اور ہوں سے آگے نہیں بڑھا۔

دوسری صبح میں کام پر چلا گیا۔ وہاں بھی تمام دن میرے ذہن پر رحمان چھایا رہا۔ دل ہی دل میں نہ جانے کتنے پروگرام بنا ڈالے۔ اتوار کی چھٹی میں کہاں کہاں گھومنے جائیں گے۔ کیا کیا کھانا کھائیں گے۔ کون سی پکچر دیکھیں گے۔

شام کو بہت خوش جب میں گھر واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رحمان اپنا سب سامان باندھے جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوا ہے۔

"یہ کیا؟ کہاں بھاگے جا رہے ہو یار؟"

"آج تار آیا ہے۔ میری چھٹی منسوخ ہو گئی۔ فوراً ہندستان بلایا ہے۔"

"کون سی فلائٹ سے جاؤ گے؟"

"رات کی فلائٹ میں سیٹ مل گئی ہے۔ بس تمھارا انتظار کر رہا تھا۔"

اس خبر سے میرا دل بجھ گیا۔ کیا سوچا تھا اور کیا سُنا۔ میں نے کہا۔" کاش رحمان تم سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو اچھا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے رخصت ہونے آئے تھے۔ ابھی تو ہم نے دل بھر کے باتیں بھی نہیں کی ہیں۔ ایک دوسرے کا پورا حال احوال بھی نہ پوچھا تھا۔"

"فرض محبت پر غالب آتا ہے سنتیش!"

ہم دونوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ کیوں کہ وقت کم تھا اور ایرپورٹ روانہ ہو گئے۔ کسٹم میں جاتے وقت وہ بڑی گرم جوشی سے گلے ملا۔"دیکھو خدا کب ملاتا ہے!" اس نے جھکی ہوئی نظروں سے یہ الفاظ کہے اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔

رحمان کو رخصت کرنے کے بعد گھر واپس آیا تو دل و دماغ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی وطن عزیز کو چھوڑنے کے بعد جس ماحول کو میں نے اپنا لیا تھا آج وہ بے حد بوجھل لگ رہا تھا۔ رحمان اور میری دوستی برسوں پرانی تھی لیکن اس قدر شدید دوستی کے باوجود وہ میرے لیے ایک معمّا تھا۔

ہم دونوں امرتسر میں رہا کرتے تھے۔ اس کے خاندان میں کتنے افراد ہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ اپنے خاندان یا کسی عزیز کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کرتا تھا۔ ہاں اس کی خواب گاہ بڑی پُراسرار تھی۔ دیوار پر دو تصویریں لگی تھیں۔ ایک تو گول مٹول پیارے سے بچّے کی تھی اور دوسری سترہ اٹھارہ سالہ خوبصورت نوجوان کی۔ سرہانے کی طرف شوکیس میں کھلونے رکھے ہوئے تھے جو غالباً اسی بچّے کے تھے۔ اس میں بھی جھنجھنے سے لے کر ٹینس کھیلنے کا ریکٹ تک تھا۔ ایک چینی کی بلّی ہے جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے۔ مٹّی کا طوطا ہے جس کی ٹانگ جھڑ گئی ہے اور لکڑی کا ایک گھوڑا ہے اس کی پیٹھ پر زین اور منہ میں لگام بندھی ہوئی ہے۔ گھوڑے کے اوپر چھوٹی سی بندوق رکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا سوار ابھی آنے والا ہے۔

میں نے اکثر راتیں رحمان کے ساتھ گزاری ہیں۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے اور جب سونے کا وقت آتا تب روشنی بند کرنے سے قبل وہ دونوں تصویروں کے پاس جاتا اور

اُن کو غور سے دیکھتا۔ کبھی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی اور کبھی آنکھوں میں آنسو
تصویروں کو دیکھنے کے بعد کھلونوں پر جھک جاتا۔ ایک ایک کھلونا اُٹھا اُٹھا کر آہستہ آہستہ
صاف کرتا اور اُن کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ اپنے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا۔

رحمان کم گو، سنجیدہ اور بے حد شریف انسان ہے۔ لیکن اس کے بارے میں طرح
طرح کی کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ پھر بھی تصویریں، کھلونوں اور اس کی خاموشی کے راز
کو کوئی نہ سمجھ سکا۔ حتیٰ کہ میں بھی بے خبر رہا۔ بعض شخصیتیں کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ باوجود گہری
دوستی کے ہم اُن کے ماضی اور حال دونوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک رحمان
ہے میرا دوست۔ انھیں خیالات میں غرق نہ جانے کب نیند آگئی۔

کچھ روز بعد ہی اخبارات میں جنگ کی خبریں آنے لگیں۔ ٹی۔ وی پر جنگ کے ہولناک
مناظر دیکھتے وقت مجھے بے ساختہ میجر رحمان یاد آجاتا۔ بھگوان جانے کون سے محاذ پر ہوگا،
کسی فوجی کی خیریت معلوم کرنا بھی تو مشکل ہے۔ میں اپنے دل کو آپ ہی تسکین دے لیتا۔
جہاں کہیں بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔

پانچ سال بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندستان واپس آیا تو امرتسر اسٹیشن پر
میرے دوستوں نے یہ بُری خبر سنائی کہ میجر رحمان پاگل ہو گیا۔

اس خبر سے میرے اُوپر بجلی سی گر پڑی۔ وطن آنے کی تمام خوشی ختم ہو گئی۔ بے ساختہ
میری زبان سے نکلا: "میرا دوست رحمان! پاگل نہیں ہو سکتا۔"

میرے دوست جمیل نے بتایا۔ ۱۹۷۱ء میں وہ بنگلہ دیش کے محاذ پر گیا تھا۔ خدا جانے
وہاں کیا دیکھا کہ دماغ اُلٹ گیا۔ اس کا بہت علاج کرایا۔ کچھ عرصے پاگل خانے میں بھی رہا۔
مگر سب علاج بے سود ثابت ہوئے۔

"ارے گھر تک تو پہنچنے دو۔ آتے ہی یہ ذکر کہاں چھیڑ دیا۔" میرے پتاجی نے ٹوکا۔
گھر آیا تو دیکھا پورا گھر عزیزوں اور رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے والدین نے میری
واپسی کی خوشی میں شاندار دعوت دی تھی۔ لوگ پھول اور مٹھائی لے کر مبارک باد دینے
آرہے تھے۔ چاروں طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میری ماں اور بہنیں کہہ رہی تھیں،

"پانچ سال کی دوری کے بعد یہ شبھ گھڑی آئی تھی" مجھے بھی بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل کر ازحد خوشی ہو رہی تھی۔ قہقہوں اور اس ہنگامے کے باوجود میرا ذہن تھوڑی دیر بعد سوچ کے سمندر میں غرق ہو جاتا تھا۔

بہن پوچھتی: "کیا سوچ رہے ہو بھیا؟ کیا لندن کی یاد آ رہی ہے۔؟"

بھابھی مذاق کرتیں: "نہیں بہن! کسی کو وہاں چھوڑ آئے ہیں اس کے خیال میں کھوئے ہوئے ہیں؟"

پورا دن کیا رات بھی اسی چہل پہل میں گزر گئی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح میں رحمان کے پاس گیا۔ گھر کی اُداسی اور بے رونقی کا اندازہ باہر سے ہی ہو گیا۔ وہ لان جو کبھی سرسبز اور شاداب رہتا تھا۔ اُس میں سوکھی ہوئی گھاس اُگی ہوئی تھی۔

میرے دستک دینے پر رحمان کے پرانے ملازم نے پھاٹک کھولا۔ مجھے پہچان کر بہت خوش ہوا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے

"رحمان کیسا ہے بابا؟"

"آپ اندر جا کے دیکھ لیجیے میں کیا بتاؤں" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

برآمدے سے گزر کر میں اندر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے پلنگ پر ہاتھوں سے سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ پورا کمرہ خالی تھا۔ نہ وہ شوکیس تھا جس میں کھلونے رکھے رہتے تھے نہ دیوار پر تصویریں تھیں۔ بس چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"رحمان!"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"رحمان! میں تمھارا دوست ستیش ہوں۔ کیا بھول گئے؟"

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتا رہا۔

میں نے پیار سے اُس کے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا، پیٹھ کو سہلایا لیکن وہ اسی انداز سے بیٹھا رہا۔

"ہاتھ ملاؤ یار! ایک مدت کے بعد ملے ہیں" اس کے دونوں ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ میں لے کر دبائے۔

رحمان نے جلدی سے اپنے ہاتھ میری گرفت سے چھڑا لیے۔ گھبرا کر اپنے ہاتھ اِدھر اُدھر سے دیکھے اور کسی قیمتی چیز کی طرح اپنے زانو کے نیچے چھپا لیے۔

"تمھیں لندن جانا یاد ہے نا؟ اور وہ رات بھی یاد ہوگی جو ہم نے باتیں کرکے گزاری تھی۔ اور پھر تم اچانک دوسرے روز وطن واپس آ گئے تھے۔"

رحمان نے گھبرا کر میری جانب دیکھا پھر آنکھیں بند کرلیں اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی سہلانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ اُن میں سرخی جھلک رہی تھی اور سر کی ہلکی سی جنبش سے ظاہر کیا۔ جیسے بھولا ہوا وقت یاد آ رہا ہے۔

"اب تو اپنے دوست ستیش کو پہچان گئے؟" اُس نے اقرار میں گردن ہلا دی

"یہ تم نے اپنی اور اپنے کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ وہ خوبصورت تصویریں اور کھلونے کہاں چلے گئے؟"

میرے آخری جملے سے اس کے صبر اور ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ اتنے عرصے میں پہلی مرتبہ وہ تیز آواز سے مخاطب ہوا "ستیش میرے بھائی! اب جنگ تو نہیں ہوگی؟" اور اپنا سر میری گود میں رکھ کر رونے لگا۔

رحمان کی آواز سن کر اس کا بوڑھا ملازم کمرے میں آیا "سینٹھ صاحب ان کو رو لینے دیجیے۔ شاید دل کا بوجھ اس طرح ہلکا ہو جائے۔ اور ہمارے صاحب اچھے ہو جائیں ورنہ تین چار سال سے یہ بالکل خاموش ہیں، نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں"۔ کافی دیر تک وہ بے قراری سے روتا رہا۔ میں نے گلاس میں ٹھنڈا پانی منگوا کر پلایا۔ رومال بھگو کر چہرہ صاف کیا۔

اب ہم خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میری تو بولنے کی طاقت ہی ختم ہو گئی تھی مگر وہ پہلے کی بہ نسبت پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس خاموشی کو اُسی نے توڑا۔

"ستیش! سب لوگ کہتے ہیں چاند پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی مگر یہ بات جھوٹ ہے۔ میں نے چاند پر خاک ڈال دی بلکہ چاند کو خاک میں ملا دیا۔"

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا

میرا جواب نہ پا کر وہ پھر مخاطب ہوا "اب مجھے یاد آگیا۔ ایک ایک بات سنا دوں گا۔ ابھی تک تو سب بھولا ہوا تھا۔ تمھیں یاد ہوگا میرے آنے کے بعد ترنگا اور سبز پرچم ٹکرائے تھے۔ کہاں؟ یہ مجھے یاد نہیں۔"

رحمان کی خوبصورت اور بلند پیشانی پر غم کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے دلی کرب کو چھپانے کے لیے بار بار ہاتھ سے چہرے کو صاف کر رہا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو میرے دوست! آگے کا حال پوچھو۔ کیا اب برداشت نہیں کر سکو گے؟"

"میں سب سن رہا ہوں تم کہو؟"

"میں جب وہاں پہنچا تو پورا علاقہ آگ کا گولا بنا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد وہ پیچھے ہٹے اور ہم آگے بڑھے۔

زمین کا سینہ داغ دار تھا اور خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ زمین ناہموار ہونے کی وجہ سے میں جیپ آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ سامنے کوئی چیز مجھے ہلتی ہوئی نظر آئی۔ رات بے حد تاریک تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کوئی زخمی تھا جو پانی مانگ رہا تھا۔

میں جیپ سے فوراً کودا اور قریب جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی جانا، پہچانا ناک نقشہ تھا۔ خوبصورت چہرہ بھرے بھرے رخسار، پیشانی پر سرخ رنگ کا تل۔ ہاں اس کی بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں اور گلابی رنگت سفید ہو رہی تھی۔

میں کون ہوں اور کہاں ہوں سب بھول گیا۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا "ریحان! میرے بھیّا تم ہو؟"

"ہاں رحمان بھائی پانی۔"

میں نے اپنے تھرمس میں سے اس کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔ خدا جانے گلے سے اترے بھی یا نہیں۔ "ہم کب اور کس حالت میں ملے؟"

"بھیا! مجھے ایک بار..... سینے سے لگا لیجیے۔ یہ آخری خواہش ہے؟" وہ بڑی مشکل سے بات کر رہا تھا۔

"میں نے دیکھا وہ بری طرح گھائل تھا اور ایک ہاتھ بھی کھو چکا تھا۔ بہت ہی آہستہ سے کہ تکلیف نہ ہو، میں نے اس کے زخمی سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ریحان میں بھی نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی، کسی طرح اپنا ہاتھ میرے گلے میں ڈال کر لپٹ گیا۔ لیکن چند سکنڈ میں گرفت ڈھیلی ہوگئی اور سر میرے زانو پر واپس آگیا۔"

مجھے یاد آیا میرے والدین بھی حادثہ کا شکار ہوئے تھے۔ مرتے وقت ماں نے ننھے ریحان کو میرے سپرد کر کے کہا تھا، آج سے اس کے بھائی نہیں بلکہ ماں باپ تم ہو۔ والدین کی وفات کے بعد میں نے اور میری خالہ نے مل کر بے حد نازوں سے پالا تھا۔ یہ خالہ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ جب انھوں نے یہاں سے ہجرت کی تو یہ بھی ساتھ چلا گیا اور میرے دل کی تسکین کے لیے صرف یادیں رہ گئیں۔

آخری نازبرداری بھی مجھ ہی کو کرنی پڑی۔ ہتھیار کی مدد سے قبر کھودی۔ اس میں سے چن چن کر کنکر نکالے۔ کہیں میرے بھائی کے نازک جسم میں چبھ نہ جائیں۔ ریحان بہت نازک مزاج تھا۔

ستیش! میری باہیں بہت روز سے جس کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین تھیں وہ میری گود میں شل تصویر کے خاموش تھا۔

"کیسے میں نے قبر میں اتارا یاد نہیں۔ ہاں میں نے اس کو پھول کی طرح اٹھایا اور خاک میں چھپا دیا ــــ سونگھو! میرے ہاتھوں میں اب تک اس کے خون کی بو بسی ہے۔ میں نے ریحان کی تمام یادگاریں صندوق میں چھپا دیں ہیں، اس ڈر سے کہ کوئی ان کو بھی نہ چھین لے۔"

پاکستان کا پہلا عید کارڈ

۲۶ر اکتوبر ۷۴ء۱۹ کا دن کس قدر مبارک ہے. آج مجھے اپنے برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے کارڈ ملے ہیں۔ عید ہر سال آتی ہے اور یہ دستور ہے کہ دور رہنے والے عزیزوں اور دوستوں کو تہنیت عید خوبصورت کارڈ کے ذریعے دیتے ہیں لیکن ہندستان اور پاکستان کے عزیز ادھر چند سال سے ایک دوسرے کو عید مبارک بھی نہیں کہہ سکتے تھے.

لیکن ہندستان میں ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور پاکستان کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جو ایک دوسرے کی جانب محبت کا ہاتھ بڑھایا ہے. اس کا پہلا اثر ہمیں عید کارڈ کی شکل میں ملا ہے. خدا کرے یہ دوستی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے راہ کی تمام دقتیں ختم ہو جائیں اور ہم سگے بھائی بہنوں کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔ آج ڈاک آنی جانی شروع ہوئی ہے. کل راستے کھل جائیں تو ایک دوسرے سے مل کر دلوں میں جو خوف ہے وہ دور ہو. محبت و پیار کا رشتہ مضبوط ہو.

آج مجھے دونوں ملکوں کے بڑے چھوٹے چھوٹے اور محبت بھرے واقعات یاد آ رہے ہیں.

جون ۷۰ء۱۹ میں میں پاکستان گئی تھی. اس وقت مجھے اندازہ ہوا وہاں کے لوگ

ہندستان سے محبت اور دوستی کے خواہاں ہیں اور یہاں کے سکھ اور پنجابی پاکستانی سرزمین کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ میں جب یہاں سے جا رہی تھی تو میری ایک پنجابی دوست نے کہا۔

"تم کراچی جا رہی ہو تو لاہور بھی ضرور جانا۔ وہاں انارکلی بازار ہے۔"

"کیا انارکلی بازار بہت خوبصورت ہے؟"

"انارکلی بازار سے ایک راستہ اندر کی طرف جاتا ہے۔ وہاں ہمارا گھر ہے۔ تقسیم سے پہلے ہم وہاں رہا کرتے تھے۔ پھر اس نے مجھے اپنے گھر کا نقشہ سمجھایا۔ تم ضرور اس کو دیکھ کر آنا اور بتانا اب وہ کیسا ہے۔ دوسری دوست نے کہا "کیماڑی جانے کے لیے سمندر پر ایک پل بنا ہے اس سے پہلے ہمارا گھر ہے۔ کراچی میں تم وہ بھی دیکھنا۔" پہلی دوست نے کہا "ہاں لاہور کے قریب دریائے راوی بہتا ہے۔ اس میں بڑے سندر بھنور بنتے ہیں۔ راوی کی شام تو مشہور ہے۔ میں تو اکثر شام کو پتاجی کے ساتھ جاتی تھی۔ تم بھی دیکھنا اور مجھے یاد کر لینا۔" میری یہ دونوں دوست کس قدر بھولی ہیں اور کتنا پیار ہے اپنے گھر سے۔ آج ۲۶ سال گزرنے کے بعد بھی اپنے اپنے گھروں کا نقشہ سمجھا رہی ہیں۔ میری تو آنکھیں نم ہو گئیں۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مجھے ہوائی جہاز میں پیش آیا۔ میرے آگے کی سیٹ پر ایک سردار جی معہ اپنی بیوی کے بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوی کے ہاتھ میں ایک بہت خوبصورت شال تھی اس پر کپڑے سے کام بنا ہوا تھا۔

"آپ نے ہندستان میں یہ کہاں سے خریدی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! یہ تو ہمارے پاکستان کی بنی ہوئی ہے۔ اس کو رلی کہتے ہیں۔"

"میں بھی پاکستان جا رہی ہوں۔ وہاں کس شہر میں یہ ملے گی؟"

"آپ ہمارے حیدر آباد سندھ جائیے گا۔ وہاں ایک بازار ہے جس کا نام ریشم گلی ہے۔ وہاں آپ کو اس قسم کا طرح طرح کا سامان ملے گا۔"

"اچھا تو آپ کا گھر حیدر آباد سندھ میں ہے؟"

"نہیں بہن جی! اب تو گھر کہیں بھی نہیں رہا۔ برسوں سے یورپ کے مختلف ملکوں میں کاروبار کر رہے ہیں۔" سردار جی نے جواب دیا۔ بس سمجھ لیجیے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھانو گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

میں تو چھبیس سال بعد اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملی تھی۔ جتنا بھی پیار و محبت وہ دے سکتے تھے دیا۔ اور اپنے باپ دادا کی سرزمین کی یاد ان کے دلوں کو کس طرح ستاتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو ان حالات سے گزرے ہیں۔ ہندستان کے بارے میں لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے تھے۔ نئی نسل تو بالکل ہی ناواقف ہے کیوں کہ اس نے اس سرزمین پر قدم ہی نہیں رکھا۔ ہاں۔ وہ لوگ جو یہاں سے چلے گئے تھے ان کے پوچھنے پر مجھے اکثر اختر شیرانی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا تھا۔

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن

عزیزوں کے علاوہ جب میں باہر کے لوگوں سے ملتی تھی اور ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ہندستان سے آئی ہوں تو وہ لوگ جو ۱۹۴۷ میں ہجرت کر گئے تھے، وہ پہلا سوال یہ کرتے تھے: کیا ہندستان اب بھی ویسا ہی خوبصورت ہے؟"

اتر پردیش میں میرا شہر بلرام پور ہے، جو کہ کوہ ہمالیہ کے سرسبز دامن میں آباد ہے۔ وہاں سڑکوں کے دونوں جانب آم اور جامن کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ وہاں کے تالابوں اور جھیلوں میں کنول کے پھول مسکراتے ہیں۔

کسی نے مجھ سے سوال کیا "کیا بلرام پور میں سڑکوں پر آم اور جامن کے پیڑ اب بھی لگے ہوئے ہیں؟ وہاں کے تالابوں میں اب بھی سنگھاڑے کی بیلیں اور کنول کے پھول کھلتے ہیں؟"

میری ایک رشتے کی بہن بیمار تھی اور وہ کراچی کے جناح اسپتال میں داخل تھی۔ میں اکثر شام کو اس کے پاس جایا کرتی تھی۔ ایک روز نرس نے میری بہن سے پوچھا۔

"کیا یہ آپ کی سگی بہن ہیں؟ جو روز آتی ہیں؟"

"ہم بچپن کی سہیلیاں ہیں اور سگی بہنوں سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں۔ بہت لمبے عرصے کے بعد ملے ہیں۔ اس لیے پیار کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے" میری بہن نے جواب دیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں جو مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے؟" نرس نے سوال کیا۔

"میں بمبئی میں رہتی ہوں۔ آج کل وہاں سے آئی ہوں۔"
بمبئی کا نام سن کر اس کا چہرۂ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ مجھ سے پوچھا۔
"کون سے حصے میں رہتی ہیں؟"
"وارڈن روڈ۔"
"ارے۔ وہ تو پیڈر روڈ کے قریب ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں بھی وہاں رہتی تھی۔"
حالانکہ وہ اس کی ڈیوٹی کا وقت تھا۔ لیکن مجھ سے کہنے لگی۔ آپ جلدی سے بتا دیجیے۔ پیڈر روڈ ہمارے وقت میں جیسی سرسبز اور شاداب پہاڑی تھی کیا ویسی اب بھی ہے؟ وہاں تو بڑے خوبصورت بنگلے بنے ہوئے تھے۔ قریب ہی حاجی علی کا مزار اور مہالکشمی کا مندر تھا۔ ہم دسہرے پر مہالکشمی کا میلا دیکھنے جایا کرتے تھے۔ اور جمعہ کو زیارت کرنے حاجی علی کے مزار پر جاتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اصلی حالت میں ہیں؟"
جب میں نے ان کو بتایا کہ یہ دونوں چیزیں ویسے ہی قائم ہیں اور اسی طرح ان جگہوں کا احترام کیا جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔
کچھ عزیز میرے حیدرآباد سندھ میں ہیں۔ میں ان سے ملنے کو گئی۔ میری بہن کے گھر کے برابر ایک خاتون رہتی ہیں۔ میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ایک بچہ آیا اور اس نے میری بہن سے کہا۔
"میری امی کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں۔"
میری بہن نے اجازت دے دی۔ فوراً ایک صاحبہ آگئیں اور بغیر تعارف کے بڑے پیار و محبت سے مجھے انھوں نے اپنے گلے لگایا اور کہا ؎

آملے ہیں سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک

میں حیرت سے ان کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ اللہ! یہ مجھے کہاں سے جانتی ہیں؟ گلے ملنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا "جب آپ رکشا سے اتریں میں نے پہچان لیا کہ آپ انڈیا سے آئی ہیں۔"
"وہ کیسے" میں نے دریافت کیا۔

"آپ جو ساری پہنے ہیں۔ یہ ہمارے بمبئی کی ہے۔ اسی لیے تو میں بے قرار ہو کر آئی ہوں۔ میں بھی کبھی بمبئی میں محمد علی روڈ پر رہا کرتی تھی مگر آب و دانہ یہاں لے آیا۔ میرا دل اس وقت جذبات سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صرف ایک پیام ہے وہ یہ کہ جب آپ یہاں سے واپس جائیں اور اُس سرزمین پر قدم رکھیں تو بمبئی اور اہل بمبئی کو میرا سلام کہہ دیجیے گا۔ خدا جانے میں کبھی جا بھی سکوں گی یا نہیں؟ میرا سلام پہنچ جائے یہ بہت ہے۔"

حیدرآباد سندھ سے کچھ میل کے فاصلے پر میری ایک دوست کا گھر تھا۔ میں نے اپنی آمد کی اطلاع ان کو خط کے ذریعے سے دے دی تھی۔ میرے وہاں پہنچنے کے دوسرے روز بچوں نے آ کر کہا۔

"امی! بابا۔ خالہ جان سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں سمجھی ان کے خاندان کے کوئی بزرگ ہوں گے: "یہ بابا کون ہیں؟" میں نے بچوں سے پوچھا۔

بچوں نے ماں کی جانب دیکھا۔ میری دوست نے بتایا یہ ایک ہندو سندھی ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کے خاندان کے کل افراد ہندستان چلے گئے۔ اب یہ دونوں میاں، بیوی یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہے۔ ہر تیوہار اور خوشی کے موقعے پر بلاتے ہیں۔ بچوں کو تحفہ دیتے ہیں۔ تم ہندستان سے آئی ہو۔ اس لیے ملنا چاہتے ہیں۔ بے حد شریف ہیں۔"

دوسرے روز میں ان کے گھر گئی۔ ایک بڑے عالیشان مکان میں دو ضعیف میاں بیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ میری بے حد خاطر مدارات کی پھر کہا۔

"بیٹی کیسا شہر ہے؟ مجھے بچوں نے بتایا آپ وہاں سے آئی ہیں۔"

"اچھا ہے۔ کیا وہاں آپ کا کوئی عزیز ہے؟"

میرے اس سوال پر بیساختہ دونوں کے آنسو بہنے لگے۔ پھر اپنے کو سنبھال کر کہا۔ "ہمارے صرف دو لڑکے تھے وہ بمبئی چلے گئے۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے اچھا کما رہے ہیں اور خوش ہیں۔ لیکن جب سے گئے ہیں واپس نہیں آئے۔ اب آپ کی دوست ہماری بیٹی ہے

اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ اس کا اور ہمارا درد بھی تو ایک جیسا ہے۔ میں اپنے بیٹوں کی صورت دیکھنے کو ترس رہا ہوں اور یہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے لیے بے قرار ہے۔"

"آپ کس خیال سے اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں گئے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بیٹی! کوئی اپنے گھر کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ لڑکے تو جوانی کے جوش میں چلے گئے۔ ہماری خاک تو اپنے بزرگوں کی خاک میں ملے گی۔ اب تو تم نے بھی دیکھ لیا۔ ہمارا دیس کتنا اچھا ہے۔ سندھ کی یہ خوبصورت چاندنی راتیں جن میں ریت ستاروں کی طرح چمکتی ہے اور شام ہوتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ایسی چلتی ہیں کہ تمام دن کی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ بمبئی میں تو سنا ہے ایک ایک دو، دو کمروں کے گھر ہوتے ہیں۔ اُن میں تو بڑی گھٹن ہوتی ہوگی بیٹی! اپنا دیس ہی سب سے پیارا ہے۔"

یہ محبت کے جذبات میں نے عوام میں بھی پائے۔ ادیب اور شاعروں میں بھی۔

صادقین پاکستان کے مشہور آرٹسٹ ہیں اور شاعر ہیں۔ نومبر ۷۰ء میں مشرقی پاکستان (جو اب بنگلہ دیش بن گیا) میں زبردست طوفان آیا تھا۔ صادقین نے دسمبر میں مشرقِ پاکستان کے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے اپنی تصویروں کی نمائش کی۔ اُس میں قرآن شریف کے بھی بہت پرانے نسخے تھے۔ جو اُن کے باپ دادا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ خطاطی کا فن ان کو اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔ اس نمائش میں صادقین نے سورہ رحمان کو بالکل ایک نئے انداز میں پیش کیا تھا۔

کراچی کے ایک بہت بڑے اور کشادہ ہال میں یہ نمائش ہو رہی تھی۔ میں بھی اس کو دیکھنے گئی۔ ہال میں علاوہ اور تصویروں کے ایک اڑتالیس فٹ لمبی تصویر تھی جو اُسی مناسبت سے جوڑی تھی۔ یہ ان کا بہترین شاہکار تھا۔ اُس میں پورے سیلاب کو سمو دیا تھا۔ تصویر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا گویا ہم خود اس طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ باپ پانی میں ڈوب رہا ہے اور اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں پر اونچا کر دیا ہے لیکن ظالم موجیں اس معصوم کو بھی نگل جانا چاہتی ہیں۔ ایک طرف بلند درختوں کی شاخوں پر بچے جھینگوں پر لٹک رہے ہیں۔ نیچے ایک عورت اپنے گھر کے سامان

کے ساتھ بدحواس بیٹھی ہوئی ہے۔ سیلاب کا پانی سامان سے ٹکرا رہا ہے۔ دوسری جانب درخت کی ڈالی پر ایک بچہ ہے اور اس کے جسم کو کالا ناگ اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ پس منظر میں دیو پیکر طوفانی موجیں ہیں جو ان کو اس سرزمین سے مٹا دینا چاہتی ہیں لیکن ان طوفانی موجوں سے بھی اوپر دو ہاتھ نظر آتے ہیں۔ جن کے اوپر قرآن شریف رکھا ہوا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا ؎

آنکھیں تو کھول شہر کو طوفان لے گیا

نمائش میں ایک ایک روپے کے کارڈ بک رہے تھے۔ معلوم ہوا ان پر صادقین اپنے دستخط کر دیں گے پھر ان کارڈوں اور تصویروں کے بکنے سے جو آمدنی ہو گی وہ مشرقی پاکستان کے مصیبت زدوں کو بھیج دی جائے گی۔

میں نے بھی ایک کارڈ خرید لیا۔ ہال کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ میں نے دیکھا وہاں بے پناہ ہجوم ہے اور لوگ باقاعدہ لائن لگائے کھڑے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا یہیں صادقین دستخط کر رہے ہیں۔ میں بھی لائن میں کھڑی ہو گئی اور جب ان کے قریب پہنچی تو دیکھا نہایت دبلا پتلا شخص۔ الجھے ہوئے بال اور سیاہ رنگ کی شیروانی پہنے نہایت تھکے ہوئے انداز میں ایک ہاتھ سے سر پکڑے ہوئے دستخط کر رہا ہے۔ دوسرا آدمی اس کو اٹھا کر واپس کر دیتا ہے۔

میں نے جب اپنا کارڈ ان کے سامنے میز پر رکھا تو انھوں نے ایک نظر میرے اوپر ڈالی اور کارڈ کی پشت پر ایک لڑکی کی تصویر بنا کر اپنے دستخط کر دیے۔ خلاف امید یہ پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کارڈ واپس لے لیا۔ پھر میرے دل میں خیال آیا یہ شاعر بھی ہیں کیوں نہ ان سے ایک شعر بھی لکھوالوں یہ سوچ کر میں دوبارہ ان کے قریب گئی تو دیکھا کچھ لڑکیاں میرے کارڈ کی تصویر کا حوالہ دے کر ان سے تصویر بنوانے کی فرمائش کر رہی تھیں۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تمھارے لیے یہی کافی ہے۔"

میرے دل میں خیال آیا۔ کہیں مجھے بھی نہ جھڑک دیں مگر پھر ہمت کر کے کہا۔

"بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میرے کارڈ پر اپنا ایک شعر لکھنے کی زحمت گوارہ کریں؟"
انھوں نے گردن اٹھا کر پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا: "کارڈ پر جگہ نہیں ہے ورنہ پوری رباعی لکھ دیتا" پھر ایک شعر لکھا ؎

ایک تجھ کو نظر نہیں آئی
ساری محفل میں میری تنہائی

کارڈ واپس دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا: "آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟" میری بھانجی نے جواب دیا "بمبئی سے یہ سردار جعفری کی چھوٹی بہن ہیں" صادقین فوراً اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "آپ جعفری کی بہن ہیں؟" اتنی دیر سے کھڑی ہیں۔ مجھے معاف کیجیے گا" پھر کہا "اس نام کو سن کر تو میری آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اور تمام تھکن دور ہوگئی۔ میں نے یہ اڑتالیس فٹ لمبی تصویر ایک ماہ شب روز محنت کرکے بنائی ہے۔ سردار جعفری کے نام میں کتنی طاقت ہے اور مجھے ان سے کتنا پیار ہے۔ یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اب تو مجھے بالکل تھکن نہیں لگ رہی"

"آپ کی اُن سے ملاقات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ بس یہ دعا ہے کہ خدا ایک مرتبہ اُن سے مجھے ملادے میں جعفری کو سورۂ رحمان تحفے میں دے رہا ہوں۔ ان کو دے دیجیے گا!"
پھر مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ سب لوگ غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔

میں نے شاعروں، ادیبوں سے لے کر عوام کے دلوں تک جو پیار و محبت کے سوتے پھوٹتے دیکھے ہیں خدا کرے وہ جلد آبشار بن کر بہنے لگیں ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان جو پابندیاں ہیں وہ ختم ہو جائیں۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے موقع ملیں اور سب لوگ اپنے اپنے مقدس مقامات کی زیارت سے فیض یاب ہو سکیں۔

نئے چمن میں نئے پھول مسکراتے رہیں

میری ایک دوست ہیں کنور جیت۔ ان میں سے ہر وقت محبت کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ اُن کے شوہر انجینئر ہیں اور دو پھول سے پیارے پیارے بچے ہیں۔ ہر طرح خوش حال ہیں۔ ان کو قدرت نے ہر نعمت بخش دی ہے۔ جب بھی ملتی ہیں بات چیت کے درمیان اپنے پنجاب کے حسن کا ذکر ضرور کرتی ہیں جو اب پاکستان میں شامل ہے اور ساتھ میں اپنے وہاں کے دوستوں کو بھی یاد کرتی ہیں۔ سب سے زیادہ ذکر وہ بچپن کی سہیلی زینب کا کرتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ مجھے بھی زینب کہہ کر مخاطب کرتی ہیں پھر چونک کر کہتی ہیں۔ مجھے تمھاری محبت میں زینب کی محبت کی جھلک نظر آتی ہے اس لیے یہ نام منہ سے نکل جاتا ہے۔

ابھی دو تین ماہ قبل کی بات ہے ایک روز ملیں تو بے حد اُداس نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی رو چکی ہیں۔

"کیا بات ہے کنور! کیوں فکر مند ہو؟ تمھیں تو خدا نے ہر دولت سے نوازا ہے۔"

"ہاں مجھے بھگوان نے سب کچھ دیا ہے مگر تمھیں نہیں معلوم ان دنیا والوں نے مجھ سے بہت ہی عزیز شے چھین لی ہے جو مجھے اب کبھی نہیں مل سکتی۔"

"وہ کیا چیز ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

کنور کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔" دیکھو آدمی کے رنگ کا کچھ حصہ کاٹ دیا جائے تو کچھ دن بعد زخم بھر جاتا ہے مگر میرا زخم تو ستائیس سال گزرنے کے بعد بھی نہیں بھرا بلکہ روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔"

میں سمجھی یہ کسی سے محبت کرتی تھی اور شادی مرضی کے خلاف ہوگئی۔"کیا تم اپنے شوہر سے خوش نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا شوہر تو دیوتا ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟ جو تم روئی ہو؟"

"آج اپنے پنجاب کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا نا! کہ تقسیم سے قبل ہم لاہور کے قریب ایک جگہ شیخوپورا ہے وہاں رہا کرتے تھے۔ میرا اور زینب کا گھر اسی طرح پاس پاس تھا جیسے ہم اور تم رہتے ہیں۔ زینب میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ ہمارے درمیان میں مذہب کا کوئی فرق نہیں تھا۔ میں اُس کے باپ کو ابا جان کہتی تھی اور وہ میرے باپ کو پتاجی۔ ہم ایک تھالی میں کھاتے تھے۔ ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ عید اور دیوالی بھی ساتھ ساتھ مناتے تھے۔ کالج میں داخلہ لیا ہی تھا کہ حالات پلٹ گئے۔ میں یہاں آگئی اور وہ وہاں رہ گئی۔ ہمارے درمیان میں جو فاصلہ تھا وہ بہت کچھ خطوط نے کم کر دیا تھا لیکن پھر وہ بھی آنے جانے بند ہو گئے۔ آج کل زینب کسی کام سے لندن آئی ہوئی ہے۔ تو برسوں کے بعد اس نے مجھے وہاں سے خط لکھا ہے۔ لو تم بھی زینب کا خط پڑھ لو۔ میں نے وہ خط کھولا۔ زینب نے اس طرح شروع کیا تھا

از لندن، ۲۸ر ستمبر ۷۴ء

پیاری بہت پیاری کنور جیت!

جب بھی کھل اٹھتے ہیں تنہائی میں یادوں کے کنول
مسکراتا ہے ترا پھول سا چہرہ کیا کیا

میں ان دنوں کچھ کام سے لندن آئی ہوئی ہوں تو پہلی فرصت میں تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ کتنے برس گزر گئے کہ ہم ایک دوسرے کی تحریر کے لیے ترس گئے ہیں، ستائیس

سال میں یاس کی طوفانی موجوں میں اُس کا بیڑا ڈوب گیا تھا لیکن یہاں آنے پر یادوں کی کشتی پھر اُبھر آئی۔ تم بے حد یاد آتی ہو۔ اب تو خدا وہ دن جلد لائے کہ ہم پھر ملیں۔ ابھی تک تو ہم خط بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اگر خط و کتابت ہی ہوتی تو وہ مختصر یا طویل خط، میٹھے پیار کی دولت دینے والے خط، مسرت آفرین دولت دینے والے خط کچھ تو ہماری زندگی میں اُمید کے چراغ روشن کرتے۔ ہائے میرے اللہ! کتنا عرصہ گزر گیا۔ آس بندھ بندھ کر ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی تصور میں بھی نہیں تھا کہ ہم اور تم اس طرح جدا ہو جائیں گے۔

پیاری کنور! اب کچھ اپنے شیخوپورا کا حال بھی سنو۔ وہاں کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ جو بچے تھے وہ ماشاءاللہ جوان ہو گئے، بلکہ کچھ تو بیوی بچوں والے بھی ہو گئے۔ تم اب دیکھو تو پہچان بھی نہیں پاؤ گی۔ ہاں! کچھ بچے نئے ملیں گے۔ جوان بوڑھے ہو گئے۔ لیکن ہمارے تمھارے سینے میں جو دل دھڑک رہے ہیں۔ وہ اب بھی ایک ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

تم لوگوں کے جانے کے بعد تمھارے گھر میں بہت سے خاندان آئے اور چلے گئے۔ اب یو۔پی کا ایک مسلم خاندان رہتا ہے۔ ان کی ایک لڑکی ہماری تمھاری ہم عمر ہے۔ اس کا نام بھی تمھارے نام کے پہلے حرف سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی کنیز فاطمہ۔ شاید کوئی نفسیاتی اثر تھا۔ میں نے کنیز سے بہت دوستی بڑھائی کیوں کہ تمھارا کمرہ جس میں ہم دونوں مل کر رہا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ بیٹھ کر پڑھتے تھے وہ کنیز کے حصے میں آیا تھا۔ میں نے کنیز کو مشورہ دے کر بالکل اسی جگہ پڑھنے لکھنے کی میز لگوائی جہاں پر تمھاری تھی اور تمھاری جگہ پر میں نے اس کا پلنگ بچھوایا جو رنگ تمھیں پسند تھا۔ اُسی رنگ کے پردے ڈلوائے تھے پھر جب میں اس کمرے میں جاتی تھی تو دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جاتا تھا۔ ورنہ تمھارے جانے کے بعد میری زندگی تو بالکل اُجڑ گئی تھی۔

ہاں! ایک قصہ اور سنو۔ کنیز کا بھائی اختر تین چار سال پہلے ہندستان گیا تھا۔ یہ لوگ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ وہاں ان کے باپ دادا کا بنوایا ہوا گھر ہے۔ ایک جگہ ہے جو قاضی صاحب کا مزار کہلاتی ہے۔ وہاں ان کے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ اختر کو تاج محل

دیکھنے کا بھی اتنا شوق نہیں تھا۔ جتنا وہ اپنا گھر دیکھنے اور اپنے بزرگوں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے بے چین تھا۔

وہاں سے واپس آکر بتا رہا تھا۔ میں نے جب آگرہ میں اپنے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی تو ایک صاحب نکل کر آئے۔ وہ دیکھنے میں سندھی معلوم ہوتے تھے۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" انھوں نے خوش دلی سے پوچھا۔

"میں پاکستان سے اس گھر کے دیکھنے کے شوق میں آیا ہوں۔ اسی کے لیے اتنا لمبا سفر کیا ہے۔ کبھی یہ ہمارا گھر تھا اب تو آپ کا ہے۔ اگر ایک نظر دیکھنے کی اجازت دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ضرور، ضرور۔ اندر آجاؤ۔ اور اب بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ پھر انھوں نے مجھے پورا گھر دکھایا۔ دالان میں تخت ویسے ہی بچھے ہوئے تھے جیسے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ اوپر میرا کمرہ بھی ویسا ہی تھا۔ نہ جانے کتنی پیاری پیاری شکلیں اور باتیں اس کمرے میں جاکر میرے ذہن میں ابھر آئیں۔ انھوں نے کہا۔ ہم نے آپ کے گھر کو خراب نہیں کیا۔ ہاں اپنی ضرورت کے لیے کچھ تبدیلی ضرور کرلی ہے پھر انھوں نے بڑے اصرار سے کھانا کھلایا اور بتایا۔ سندھ میں ہم بھی اپنا گھر چھوڑ آئے ہیں۔

کنور پیاری! یہ بتاؤ دونوں جگہ کے لوگوں کے دلوں میں جب یہ پیار محبت کا جذبہ موجود ہے تو پھر ہمارے تمھارے درمیان یہ دیواریں کیوں کھڑی ہیں۔ اب تو کچھ حالات بہتر ہونے کی امید ہے۔ شاید میری واپسی تک ڈاک آنی جانی شروع ہوجائے۔

تم دونوں کیسے ہو؟ ان دیکھے بچوں کو میری جانب سے بہت سا پیار۔

تمھاری زینب

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے ڈاک کی پابندی ختم ہوگئی۔ کنور نے بے حد خوبصورت عید کارڈ خرید کر زینب کو بھیجا۔ پھر دیوالی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دیوالی ہندستان کا بہت خوبصورت تیوہار ہے۔ سب گھروں کے بام و در چراغوں سے روشن ہو جاتے ہیں۔ ہندو اس رات لکشمی پوجا کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ لکشمی دیوی آتی ہے لیکن

اس سال لکشمی اپنے ساتھ امن اور محبت کی دیوی کو بھی لائی ہے۔ خدا کرے ان چراغوں کی روشنی دونوں جگہ کو منوّر کر دے۔

دیوالی کے موقع پر میں اپنے وطن چلی گئی تھی۔ جب واپس آئی اور نئے سال کی مبارک باد دینے کنور کے پاس گئی تو وہ مجھے غیر معمولی طور پر خوش نظر آئی۔ دوڑ کر میرے گلے سے لپٹ گئی: "دیکھو یہ دیوالی کتنی مبارک ہے میرے پاس زینب کا بھیجا ہوا دیوالی کارڈ آیا ہے۔ برسوں کے بعد ہم ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہوئے ہیں۔ زینب نے عید کارڈ کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ وہ بڑی جلدی جلدی بول رہی تھی۔ دیکھنا اس پر شیخوپورا کی مہر ہے اور وہیں سے اس نے بھیجا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کنور نے میرے ہاتھ سے کارڈ چھین کر بیتابی سے چوم لیا: "بھگوان! میرا پنجاب اور میری زینب دونوں خوش آباد رہیں"

"ارے مجھے یہ دیوالی کارڈ دیکھنے تو دو۔" میں نے کنور سے کہا۔

اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے میرے ہاتھ میں واپس کر دیا۔ "تمھیں معلوم ہے میری زینب بہت بڑی آرٹسٹ ہے۔ یہ اس نے خود ہی بنایا ہے۔ کارڈ واقعی بے حد خوبصورت تھا۔ اس کے حاشیے پر ننھے ننھے چراغ بنے ہوئے تھے اور درمیان میں زینب نے اپنی تصویر لگا دی تھی۔ تصویر کے اوپر ایک مصرع لکھا ہوا تھا: ___ آپ کے سامنے گر میں نہیں تصویر تو ہے

کنور نے پھر بیتاب ہو کر کارڈ لے لیا۔ "میں نے اس مصرعے کے جواب میں لکھا ہے ؎

ایک تیری خاموشی سے مجھ کو ہوتا ہے ملال
ورنہ سب باتیں پسند آئیں تیری تصویر کی

پھر انھوں نے مجھے ایک خوشخبری اور سنائی۔ اب پاکستان کی طرف سے ننکانہ صاحب جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ بمبئی سے کئی سو سکھ جا رہے ہیں۔ میری ماں نے اپنے ایک جاننے والے کو تھوڑے سے گیندے کے بیج دیے ہیں اور کہا۔ بیٹا! جب تم سرحد پار کرو تو ان بیجوں کو وہاں بکھیر دینا۔ تاکہ اب کبھی جنگ کے بادل گھر کر نہ آئیں بلکہ ہماری سرحد گیندے کے سنہرے پھولوں سے جگمگاتی رہے۔ امن اور شانتی کے پھول ہمیشہ کھلے رہیں۔

خون کا رشتہ

آج شیلا کے دل کا اپریشن ہوا تھا۔ یہ ہندستانی ڈاکٹروں کا قابل فخر کارنامہ تھا۔ یہ لڑکی بہت دنوں سے ڈاکٹروں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور آج انھوں نے اس نوشگفتہ کلی کو مرجھانے سے بچا لیا تھا۔ وہ اسپتال کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔

اپریشن ہوئے چھ، سات گھنٹے گزر چکے تھے۔ شیلا کی حالت اطمینان بخش تھی۔ اُس کے کمزور جسم میں خون پہنچا کر نئی طاقت اور تازگی لائی جا رہی تھی۔ اس وقت زندگی پانے والی سے زیادہ زندگی دینے والوں کے چہرے اپنی کامیابی پر کھلے ہوئے تھے۔

اچانک اس خوشی پر پریشانی کے بادل گھِر آئے۔ سسٹر نے ڈاکٹر کو آکر بتایا:

"جس گروپ کا خون شیلا کو دیا جا رہا ہے اس کے کچھ ٹیوب خراب نکل گئے ہیں اور جس مقدار میں مریضہ کو خون دینا چاہیے وہ اب نہیں دیا جا سکتا۔"

اس خبر سے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت کے قدم تھم گئے لیکن چند ہی منٹ میں اسپتال کی خاموش فضا میں ہلچل مچ گئی۔ چاروں طرف ٹیلی فون کیے گئے۔ بلڈ بینک سے خون لانے کے لیے آدمی بھیجا گیا آج تو کسی بھی قیمت پر یہ جان بچانی تھی ورنہ یہاں موت اور زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی یہ تو دنیا میں آنے اور جانے کا پلیٹ فارم ہے۔

جہاں آنے والے کو خلوص دل سے خوش آمدید نہیں کہا جاتا اور جانے والے کے لیے کسی کی آنکھ نم نہیں ہوتی۔ لیکن اس لڑکی کی جان بچانا سب ہی اپنا فرض سمجھ رہے تھے کیوں کہ شیلا کا تندرستی حاصل کرلینا سرجری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا تھا۔

باوجود ان تمام کوششوں کے بھی جب خون دستیاب نہیں ہوا تب اسپتال کے کئی سرجنوں کی جانب سے ریڈیو پر عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ دل کی اس مریضہ کو انسانیت کے نام پر اپنا خون دینے آئیں اور واقعی انسانیت جاگ اٹھی۔ کافی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے، لیکن اتنے آدمیوں میں کسی کا بھی خون اس معصوم جان نے قبول نہیں کیا۔

اب آخری بوتل میں بھی بہت تھوڑی مقدار میں خون رہ گیا تھا۔ رات بڑھتی جارہی تھی اور چراغِ زندگی مدھم ہوتا جارہا تھا۔

ڈاکٹر نہایت پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے جن کو بار بار رومال سے صاف کر رہا تھا۔ ہر مرتبہ پسینہ پوچھنے کے بعد اس کی نگاہیں دیوار پر لگی بڑی گھڑی کی طرف اٹھ جاتیں جس کی ٹک ٹک گزرتے ہوئے وقت کا بڑی شدت سے احساس دلا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اب کیا کروں؟ کیا میری اتنی بڑی کامیابی ناکامی میں تبدیل ہو جائے گی؟ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

اسی وقت اس کا اسسٹنٹ ایک چالیس، پینتالیس سال کی عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور کہا: "یہ ریڈیو پر ہماری اپیل سن کر خون دینے آئی ہیں۔"

فاطمہ فوراً ہی بولی: "میں بہت دور سے آرہی ہوں اس لیے دیر ہو گئی۔" پھر اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا: "مہربانی سے آپ لوگ جلدی کیجیے اگر میرا خون کام آگیا تو مجھے اتنی دور آنے کا پھل مل جائے گا۔"

ڈاکٹر نے تعجب اور حیرت سے فاطمہ کی جانب دیکھا اور اپنے ساتھ شیلا کے کمرے میں لے گیا۔ خوش قسمتی سے فاطمہ کے خون کا گروپ شیلا کے خون سے مل گیا۔ شعاعِ اُمید پھر روشن ہوگئی دونوں برابر لیٹی ہوئی تھیں۔ فاطمہ کا گرم گرم خون شیلا کے کمزور جسم

میں ایک نئی روح پھونک رہا تھا۔

حسب ضرورت خون پہنچا دینے کے بعد ڈاکٹر فاطمہ کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ ایک پیالی کافی پلائی پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے ڈاکٹر؟" اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

"آپ کے خون کا معاوضہ۔" ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔

"میں نے وقت پر پہنچ کر ایک جان بچالی بس یہی میرے خون کا معاوضہ ہے۔"

ڈاکٹر بغور اس کی شکل دیکھنے لگا۔ سوچ رہا تھا یہ کیسی عجیب عورت ہے جو پیسے لینے سے انکار کر رہی ہے۔ یہاں تو ایک بوتل خون دے کر لوگ خوشی سے دس پانچ روپے لے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو ہمارے اسپتال کا طریقہ ہے۔ آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔"

فاطمہ کچھ دیر خاموش رہی۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے خون بیچنا اور خریدنا نہیں چاہیے۔ یہ تو ایسا تحفہ ہے جو نئی زندگی کے ساتھ مذہب اور سماج کی بنائی ہوئی تفریق کو بھی مٹا دیتا ہے۔"

"محترمہ! آپ نے ایسے وقت پر ہماری مدد کی ہے جب تمام تدبیریں بےکار ہو چکی تھیں۔ ہم آپ کے بے حد احسان مند ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو اس طرح کئی بار خون دے چکی ہوں۔"

"جب خون ہی آپ کا ذریعہ معاش ہے تو مجھ سے بھی اس کی اجرت لے لیجیے۔ آپ رات کے بارہ بجے ہماری مدد کرنے آئی ہیں۔"

فاطمہ کو غصہ آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں پیٹ کی خاطر خون نہیں بیچتی۔ میں تو ممتا کی آگ بجھاتی ہوں۔ جب میں کسی کی جان بچا لیتی ہوں تو کچھ دن کے لیے میرے بے قرار دل کو قرار آ جاتا ہے۔"

"ممتا کی آگ بجھانے کے لیے وہ کیسے؟" ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ بڑا ہی پُر درد واقعہ ہے ڈاکٹر صاحب۔" یہ کہتے ہوئے فاطمہ کا چہرہ آنسوؤں سے

تر ہوگیا:

"مجھ بیوہ کا ایک ہی لال تھا۔ ایک روز اسپتال سے واپس آتے ہوئے اُس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ میں جلدی سے بچے کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس بھاگی۔ اس کی پیشانی سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔ جب میں اسپتال پہنچی ہوں تو میری سفید ساری لال ہو چکی تھی۔ بچے کے گرم گرم خون سے میرا جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اسپتال کے سفید بستر پر میرا بچہ بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پٹی باندھنے کے بعد میری طرف دیکھا۔

"میرے بچے کو کتنی دیر میں ہوش آجائے گا؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟؟"

"بچے کے چوٹ بہت سخت آئی ہے اور جسم سے خون بہت نکل گیا ہے اگر اتنا ہی خون پہنچا دیا جائے تو زندگی کی اُمید ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! تو پھر آپ کیا سوچ رہے ہیں! جلدی خون پہنچا دیجیے۔ کسی بھی طرح آپ میرے بچے کو بچا لیجیے۔"

"مگر جتنے خون کی اس وقت ضرورت ہے۔ اس کی قیمت دو، ڈھائی سو روپے ہوگی۔"

"ڈاکٹر! بڑے تعجب کی بات ہے۔ خون کی قیمت دو، ڈھائی سو روپے؟ تو کیا خون بھی بیچا جاتا ہے۔ وہ خون جو نسلوں کو بڑھاتا ہے۔ محبت کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح بکنے لگا؟"

"جی ہاں! اس کی قیمت دواؤں سے بھی زیادہ ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب کیا کروں؟ اتنا پیسا کہاں سے لاؤں۔ ہاتھ گلے میں کوئی زیور بھی نہیں تھا جو بیچ دیتی اور اپنے مرحوم شوہر کی نشانی کو بچا لیتی۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے نرس سے کہا۔ آپ اس وقت خون پہنچا دیجیے میں کچھ دن بعد اس کی قیمت ادا کردوں گی۔ میں بھیک نہیں مانگ رہی اپنے بچے کی زندگی مانگ رہی ہوں۔

نرس نے جھڑک دیا۔ "او بائی! ایک بات بول دیا۔ اب مغز مت چاٹو۔"

دفعتاً میرے بچے کا چہرہ سرسوں کے پھولوں کی مانند پیلا پڑ گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ تب مجھے ہوش آیا۔ میں بھاگ کر نرس کے قریب گئی۔"

"سسٹر! آپ کو جتنے خون کی ضرورت ہو وہ میرے جسم سے لے لیجیے۔ آپ جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیے میں اپنا خون دوں گی۔"

"ڈاکٹر واپس آگیا۔ خون دینے کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے ننھے ننھے ہاتھ پانو بالکل ٹھنڈے تھے۔ میں نے بڑھ کر بچّے کو سینے سے لگانا چاہا لیکن نرس نے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ بچّے نے میرا یہ آخری تحفہ بھی قبول نہیں کیا۔ کانپ کر اس نے اپنی بند مٹھیاں کھول دیں اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں اپنے بچّے کو رخصتی پیار بھی نہ کر سکی۔"

"اس حادثے کے بعد سے ڈاکٹر صاحب! میں تھوڑے وقت گزرنے کے بعد اپنا خون مختلف اسپتالوں میں جا کر دیتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ سب اسپتالوں میں یہ ہر وقت موجود رہنا چاہیے۔ نہ جانے کس وقت کس ماں کے لال کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈاکٹر صاحب! ایک خاص بات اور ہے مجھے کبھی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ جس وقت یہ خیال آتا ہے میری نسوں میں دوڑنے والا خون صرف میری ہی نہیں دوسروں کی بھی زندگی بن رہا ہے تو اس وقت میرے جسم میں ایک نئی طاقت آجاتی ہے جو خون دینے کی امنگ کو اور بڑھا دیتی ہے۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ ہر مرتبہ خون دینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنے مرتے ہوئے بچّے کو بچا لیا۔ اور یہ سچ بھی ہے ڈاکٹر! خون کے رشتے سے تو اب یہ سب میرے ہی بچّے ہوئے نا؟"

"اب آج سے شیلا بھی میری ہی لڑکی ہے۔ خدا اس کو زندگی کی ہزاروں بہاریں دیکھنی نصیب کرے!"

یہ کہہ کر فاطمہ کمرے سے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر کی زبان سے بیساختہ نکل گیا یہ دنیا انسانیت کے ایسے ہی ستونوں پر قائم ہے۔

آخری تصویر

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا۔ سفید ساری میں ملبوس ایک لڑکی کھڑی ہے۔

"میں فاطمہ فیضی ہوں۔ کیا اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصّہ آپ مجھے دے سکیں گے؟"

وہ نیچی نظریں کیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر زیرِ لب کہا۔

"فاطمہ فیضی؟"

"جی ہاں۔"

اس نے دروازے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ فاطمہ نے اس کی جانب دیکھا پھر ہلکے ہلکے قدموں سے اندر داخل ہوئی اور ایک کرسی کے قریب جاکر ٹھہر گئی۔

اس نے ہاتھ سے فاطمہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

فاطمہ نے نیچی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس نے سُنا تھا حسن بالکل تنہا رہتا ہے لیکن گھر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بہت ہی خوش مذاق اور سلیقہ مند عورت نے سجایا ہے۔ چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی پھر اس سکوت کو فاطمہ نے توڑا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے شرف ملاقات حاصل ہو گیا۔"

حسن بے چین ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے کرسی کو پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی وہ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔

آپ نے گھر بے حد خوبصورت جگہ بنایا ہے۔ چاروں طرف قدرتی حسن بکھرا ہوا ہے۔" فاطمہ نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں کھڑکی کے باہر چڑھتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھیں۔

"اسی حسن کو آپ نے اپنی تصویروں میں سمیٹ لیا ہے؟" فاطمہ نے بات جاری رکھی۔ یکبارگی وہ چونک پڑا اور فاطمہ کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ فاطمہ شرما گئی وہ اپنی انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

اتنے عرصے تک خاموش رہنے کے بعد حسن پہلی مرتبہ مخاطب ہوا۔

"تم نے میری بنائی ہوئی تصویریں کہاں دیکھیں؟ میں نے تو برسوں ہوئے اس شغل کو چھوڑ دیا۔"

گھنی پلکوں کے نیچے فاطمہ کی آنکھیں چمک اٹھیں: "ہمارے کالج میں آپ کی بنائی ہوئی سینریاں موجود ہیں۔"

"تمھارے پاس کون سا مضمون ہے؟"

"آرٹ مجھے اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔"

"ہونی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا اور باہر باغ میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگا۔

فاطمہ حسن کے اس رویے سے اکتا گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھر مخاطب ہوئی۔

"ہمارے پرنسپل ایس۔ ایس۔ کپور صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے وہ آپ کے بارے میں ہمیں بتا رہے تھے۔ سنا ہے پہلے آپ سینریاں بنایا کرتے تھے پھر ایسی تصویروں کا ایک سیٹ تیار کیا جس کی کبھی نمائش نہیں ہوئی لیکن دیکھنے والے اس کو آپ کی بہترین تخلیق کہتے ہیں۔"

"کپور صاحب میرے دوست ہیں اس لیے تعریف کر دی۔" چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

فاطمہ نے جواب دیا "آرٹ کے معاملے میں اُن کی نظر بہت گہری ہے۔ محض دوستی کی بنا پر وہ کسی کی تعریف نہیں کر سکتے۔ اُن کا خیال ہے جھوٹی تعریف انسان کا مستقبل خراب کر دیتی ہے۔"

"مستقبل کو تو نہ جانے کون کون سی باتیں خراب کر دیتی ہیں۔" حسن نے اُداس لہجے میں کہا۔

"انھیں تصویروں کے دیکھنے کا شوق مجھے آپ کے پاس لایا ہے۔"

ایک دم حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"کیا آپ مجھے تصویریں دکھانے کی زحمت گوارہ کریں گے؟" فاطمہ نے پُر شوق لہجے میں سوال کیا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ تھم گیا۔ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور چند منٹ کے وقفے کے بعد برابر کے کمرے کا بھاری پردہ سرکا دیا۔ فاطمہ اندر آئی اس نے دیکھا کمرے کی دیواروں پر اکیس تصویریں آویزاں تھیں۔ ان پر سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرہ اگربتی کی خوشبو اور تازہ گلابوں سے مہک رہا تھا۔ درمیان میں دو تپائیوں پر الگ الگ رنگ اور برش رکھے ہوئے تھے۔ اُن کے قریب دو نامکمل خاکے بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کام کرتے کرتے ابھی کوئی اُٹھ گیا ہے۔ فاطمہ ایک تصویر کے قریب گئی اور حسن کی جانب دیکھا۔

"کیا کرو گی ان کو دیکھ کر؟ چھوڑو اس خیال کو۔"

"اب تو ضرور دیکھوں گی میرا اشتیاق تو یہاں آ کر اور زیادہ ہو گیا۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔

حسن بوجھل قدموں سے آگے بڑھا اور تصویر نمبر ایک کا پردہ اُٹھا دیا۔ اس میں صبح کا منظر دکھایا تھا۔ ایک بے حد خوبصورت گھر کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی لمبی ادھ کھلی چوٹی کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پیچھے سے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنیں بالوں کو چمکا رہی تھیں۔ چونکہ پشت تھی لہٰذا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"پہلی ملاقات" اس کے بعد دوسری تصویریں تھیں۔ ہر ایک میں وہی لڑکی کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی تھی۔ کسی میں شاخ گل کی طرح جھکی ہوئی کسی میں پھولوں میں گھری ہوئی۔

"بہت لاجواب شاہکار ہیں۔ یہ تو بالکل کہانی کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔"

"ہاں! کسی کی کہانی اور میری باقی زندگی کا سرمایہ۔"

"ایک سوال پوچھ سکتی ہوں۔"

"ضرور۔"

"آپ نے ایک ہی لڑکی کی سب تصویریں بنائی ہیں؟"

"ہاں" حسن نے گہرا سانس لیا۔

"لیکن لڑکی کا چہرہ صاف طور سے کیوں نہیں نظر آتا؟"

"اکیسویں تصویر میں پوری شکل دیکھ لینا۔"

"یہ کس خیال کے تحت؟"

"مجھے زیادہ پریشان مت کرو" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

فاطمہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بیٹھ جاؤ" وہ پہلے کی طرح پھر پُرسکون نظر آنے لگا۔ "ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔"

فاطمہ بیٹھ گئی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

حسن بے حد نرمی سے مخاطب ہوا۔ "معاف کرنا مجھے غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے۔"

فاطمہ بہت سے مصوروں سے مل چکی تھی۔ ان کے بہترین شاہکار دیکھ چکی تھی لیکن اس قدر نرم و گرم طبیعت رکھنے والا آرٹسٹ اس نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کو اب حسن کے فن سے زیادہ اس کی تہ دار شخصیت سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ چند سیکنڈ تک وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔

"اگر بارِ خاطر نہ ہو تو ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں؟"

"بڑے شوق سے پوچھ سکتی ہو" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"آپ کی توجہ قدرتی مناظر کی طرف سے کیوں ہٹ گئی؟"

ماضی کو دہرانے سے کچھ حاصل نہیں لیکن تمھاری خواہش ہے تو سنو ؟ شاید مجھے بھی برسوں کے بعد تھوڑا اسکون مل جائے۔

"" میں نے اپنی تصویروں کی نمائش کی تھی۔ اُس کے دو، تین روز بعد ایک لڑکی مجھ سے ملنے آئی اس کے چہرے پر صبح کے پھولوں جیسا نکھار تھا۔ اور آنکھیں! ان کی تو میں تعریف ہی نہیں کر سکتا۔ ویسے تو میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی تھیں۔ چنچل مسکراتی ہوئی آنکھیں، شرم وحیا کے بار سے جھکی ہوئی آنکھیں، محبت کے نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، دنیا کی سرد مہری سے بجھی ہوئی آنکھیں، مکاری اور چالاکی سے بھری ہوئی آنکھیں، ذہین صاف و شفاف آنکھیں لیکن اس قدر پُر نور اور معصوم آنکھیں میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا تمام دنیا کی خوبصورتی ان میں سمٹ کر بھر گئی ہے۔ ان خوبصورت جھیلوں میں ڈوبنے کے بعد جب میں ابھرا تو دیکھا وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔

"تشریف رکھیے۔" میں نے کرسی آگے بڑھائی۔

اُس کی لمبی لمبی پلکیں جھک گئیں۔ کرسی پر بیٹھ کر آہستہ سے بولی: "مجھے عایشہ کہتے ہیں۔"

"بے حد موزوں نام ہے۔" میں نے کہا۔

وہ جھینپ گئی۔ اُس کی گھنی پلکوں کا سایہ پھر رخساروں پر پڑنے لگا۔

عایشہ کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا۔ پہلے اُس نے اس پر نظر ڈالی پھر مجھ سے کہا: "آپ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ خاموش ہو گئی پھر کچھ سوچ کر بولی: "یہ عزت افزائی کیا کم ہے کہ آپ نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ کیا اس بات کی اُمید کروں کہ آپ مجھے اپنا نیک مشورہ بھی دیں گے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ میں ملاقات جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔

"اپنی بنائی تصویروں کے بارے میں آپ کا نظریہ معلوم کرنا چاہتی ہوں؟" اس نے میرے سامنے میز پر تین، چار تصویریں پھیلا دیں۔ تصویریں بہت عمدہ تھیں جو بنانے والی کی ذہنی صلاحیت کو ظاہر کر رہی تھیں۔ ان میں زندگی کی تازگی تھی اور حقیقت کی چمک۔

"بہت خوب۔" بیساختہ میری زبان سے نکل گیا: "اگر یہ مشق جاری رکھی تو آیندہ آپ

بڑا نام پیدا کریں گی۔"

"زہے نصیب" اُس نے زیرِ لب کہا۔ رخسار اور بھی سرخ ہو گئے۔

اس ملاقات کے بعد وہ اکثر میرے پاس آتی۔ ہم دونوں اپنی اپنی تصویریں دکھا کر تبادلۂ خیالات کرتے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے کہ کام بھی ساتھ مل کر کرنے لگے۔ یہ جو دو نامکمل خاکے تمھارے سامنے ہیں ایک عالیشہ کا ہے اور دوسرے پر میں کام کر رہا تھا لیکن اب یہ کبھی مکمل نہیں ہوں گے۔

جب ہم رنگوں کی دنیا سے اکتا جاتے تب باغ میں جا کر پھول لگاتے۔ اُس کو پھولوں کا بے حد شوق تھا یہ جو میرے گھر کے سامنے باغ لگا ہوا ہے اس کو بھی عالیشہ کے ہاتھوں نے سنوارا ہے۔ پھر کافی کے دور چلتے۔ مختلف موضوع پر باتیں ہوتیں۔ شعر و شاعری پر بحث ہوتی، سیاست پر جھڑپیں ہوتیں کبھی وہ میری ہم خیال ہو جاتی اور کبھی مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا پھر ہم ایک دوسرے کے مخلصانہ مشورے قبول کر لیتے۔

ہم رنگوں اور پھولوں کے سحر میں کتنے دن کھوئے رہے یہ یاد نہیں ہے۔ ہاں ایک شام اس نے کہا: "اب میں دو، تین روز نہیں آؤں گی۔ میرے گھر مہمان آرہے ہیں۔"

"کیا تمام وقت مہمانوں کی خاطر کرنا تمھارا ہی فرض ہے؟"

وہ حسبِ عادت ہنس پڑی۔

دوسرے دن تیسرے دن یہ جانتے ہوئے کہ وہ نہیں آئے گی میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری طرح گھر کی ہر چیز عالیشہ کی منتظر ہے۔ دو دن سے گلدانوں میں باسی پھول لگے ہوئے تھے کسی نے ان کو تازہ گلابوں سے نہیں سجایا تھا۔ باغ میں پودے مرجھا رہے تھے۔ کتابوں پر گرد جمع گئی تھی۔ گھر کی ہر چیز بے ترتیب تھی۔ کافی پینا میرا بہترین شغل تھا لیکن اب اس میں بھی لطف نہ آتا تھا۔ عالیشہ کافی بہت عمدہ بناتی تھی اس کو قدرت نے ہر کام کرنے کا سلیقہ دیا تھا۔ میں اپنا کام بھی نہیں کر سکا۔ زندگی جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا عالیشہ تو میری زندگی کا جزو بن گئی اس کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

دفعتاً میرے ذہن میں اپنی ماں کا چہرہ ابھرا۔ کسی بات پر والدین کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ میری ماں کہہ رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو لے لو اور میری جان چھوڑ دو۔ والد گرجدار آواز میں کہہ رہے تھے۔ ہاں دے دو میرے بیٹے کو۔ میں اس خوف سے کہ میری ماں مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائیں ان کی گردن میں باہیں ڈالے سینے میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ ایک بار غصّہ میں ماں نے گردن سے میری باہیں جھٹک کر نکال دیں اور والد کی گود میں پھینک کر چلی گئیں۔

پھر ماں کے چلے جانے کے بعد کی بھیانک راتیں یاد آئیں۔ والد ایک ملازم کے سپرد کر کے کلب چلے جاتے تھے۔ وہ مجھے بستر پر لٹا کر روشنی بند کر دیتا تھا اور اپنے منہ سے طرح طرح کی خوفناک آوازیں نکالتا تھا تاکہ میں ڈر کر جلدی سو جاؤں۔ جب رات میں کسی وقت میری آنکھ کھلتی تو وہی تاریک کمرہ اور ٹھنڈا بستر اور میرے کانوں میں گونجتی ہوئی خوفناک آوازیں ہوتیں۔ میں ہاتھ سے بستر کو ٹٹولتا۔ امّی! میری امّی! لیکن امّی کے بجائے خالی بستر پر ہاتھ پڑتا تو میں خوف و دہشت سے کانپ جاتا۔ ڈر کی وجہ سے منہ سے چیخیں نکلنے لگتیں اور میں اسی حالت میں دوبارہ سو جاتا۔

عورت بڑی ظالم ہوتی ہے۔ اسی خیال سے میں ہمیشہ لڑکیوں سے دور رہا اور زندگی کی راہوں پر تنہا بھٹکتا رہا لیکن اب میرے سامنے عائشہ تھی پیکر خلوص و محبت۔ نہ معلوم اس نے کب میرے دل کے تاریک گوشوں کو منور کر دیا تھا پھر خیال آیا میں شادی کر لوں ماں بننے کے بعد یہ بھی ایسی ظالم ہو جائے اور پھر میرا بچّہ بھی میری جیسی زندگی گزارے تو؟ نہیں یہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ اس شمع کا بجھا دینا زیادہ اچھا ہے جس سے آگ لگنے کا ڈر ہو۔

ایک صبح وہ مسکراتی ہوئی آئی: "دیکھیے آپ کے لیے کتنی اچھی چیز لائی ہوں" یہ کہتے ہوئے اپنا نیا شاہکار میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ وہ تصویر تھی جس پر گذشتہ چھ ماہ سے محنت کر رہی تھی اور میری رائے تھی آئندہ ہونے والی نمایش میں اس پر پہلا انعام حاصل کرے گی۔ مگر اس وقت خوش ہونے کی بجائے مجھے غصّہ آگیا۔

میں نے جھنجھلا کر کہا: "یہ بچوں کی سی آڑی ترچھی لکیروں پر میں اپنا وقت ضائع

کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیا کہا؟؟" وہ حیرت و تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تم نے سنا نہیں عائشہ! میں تمھیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ آج صاف بتا رہا ہوں بُرا لگے یا بھلا تم میں آرٹسٹ بننے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ہٹاؤ اس کو میرے سامنے سے اور اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے دونوں ہاتھوں سے مسل کر اس کی بہترین تخلیق کو زمین پر پھینک دیا۔

"یہ احساس آج آپ کو ہوا؟" اس نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس سے آگے وہ باوجود کوشش کے نہ بول سکی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن ان موتیوں کے برسنے سے پہلے وہ چلی گئی۔ عائشہ پیار بن کر اس گھر میں آئی تھی اور خوشبو کی طرح میرے کمرے سے نکل گئی۔

اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی کا دل توڑ دینا بڑا آسان کام ہے۔ میں بھی اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھا مگر دو، تین دن بعد اندازہ ہوا محبت کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئیں تھیں جن کو نفرت کی بجلی بھی نہیں جلا سکی۔ میں تمام وقت اس کو بھلانے کی ناکام کوششیں کرتا لیکن میرے تو گھر کے ذرّے ذرّے میں اس کی یاد بسی ہوئی تھی۔ رنگ بھرنے کا برش اٹھاتا تو اس پر عائشہ کی پتلی پتلی انگلیوں کے نقش نظر آتے۔ میں اُلجھ کر کام کرنا بند کر دیتا اور باغ میں چلا جاتا تو وہاں کھلے ہوئے گلاب مجھے عائشہ کے چہرے کی یاد دلاتے وہ ان پودوں کو کس پیار سے سنوارتی تھی۔

ماضی کو بھلانے اور مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے میں اپنے دوستوں کے ہمراہ کچھ روز کے لیے ایک صحت افزا مقام پر چلا گیا۔ وہاں رہ کر میرے ذہن سے ہر نقش مٹ گیا۔ بے حد مسرور اور خوشگوار دن گزارنے کے بعد جب واپس آیا اور دوبارہ اپنی نقش و نگاری کی دنیا میں ڈوب کر اُبھرا تو میرے ہاتھوں میں عائشہ کی تصویر تھی۔ جس میں "پہلی ملاقات" کا سین ہے جو ابھی تم نے دیکھی ہے۔ یہ کیسے بن گئی مجھے خود نہیں معلوم؟ اس کے بعد کی یہ بیس تصویریں ہیں۔

ایک روز صبح کی ڈاک سے عالیشہ کے والد کی طرف سے مجھے عالیشہ کی شادی کا کارڈ ملا۔ لیکن باوجود کوشش کے میں شرکت نہیں کر سکا۔

وقت گزرتا رہا۔ تقریباً سال بھر بعد کسی نے فون پر مجھے بتایا۔ عالیشہ فیفی ایک بچّی کی پیدائش کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کے آگے میں کچھ نہ سن سکا۔ میں نے ریسیور پٹک دیا۔ اور میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔ عالیشہ! تم بہت بڑی فن کار ہو۔ موت کی آغوش میں جاتے ہوئے بھی زندگی کے خاکے میں نیا رنگ بھر گئیں۔ اس کے بعد میں نے یہ آخری تصویر بنائی اور اپنے برش کو توڑ دیا۔ یہ کہہ کر حسن نے تصویر کا پردہ اٹھا دیا۔

ایک عورت کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور قریب ہی نوزائیدہ بچّی اپنا انگوٹھا چوس رہی تھی پس منظر میں آسمان پر کالی گھٹائیں اُمنڈ رہی تھیں۔

" میری ممی۔ فاطمہ فیفی نے تصویر پر سر جھکا دیا۔

حسن آگے بڑھا۔ فاطمہ کے شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا" معاف کرنا بیٹی! پیمانۂ صبر تم ہی نے چھلکا دیا۔"

سُنہرا خواب

ہمارا دیس آج ترقی کے راستے پر ہے۔ آنے والے پانچ سالوں میں ہم نئے صنعتی کارخانے کھولیں گے۔ نئے نئے ڈیم بنائیں گے۔ نہریں نکالیں گے تاکہ دریاؤں کا وہ پانی جو ہر سال سیلاب کی شکل میں ہزاروں انسانوں کی جان لے لیتا ہے اور ہزاروں ایکڑ زمین کو بنجر بنا دیتا ہے وہ کھیتوں کو سیراب کرے گا۔ اور اس طرح ہندستان کی آبی اور زرعی دولت میں اضافہ ہوگا۔ ہم بھارت سے ٹی۔ بی کو بھی مٹا دیں گے۔ مریضوں کے لیے نئے سینی ٹوریم بنائیں گے۔ ان میں غریبوں کے لیے مفت دوا اور غذا کا انتظام ہوگا۔ بیماری اور بیکاری کا خاتما ہو جائے گا۔ ہماری سوشلسٹ حکومت میں کوئی شخص بھوکا نہ رہے گا۔ مزدوروں کے لیے ہم گھر بنائیں گے۔ اور ہر گھر میں بجلی اور پانی کا نل ہوگا۔

آج پنچ سالہ پلان کے سلسلے میں دادر میں نمائش تھی اور اس کا افتتاح کرنے ایک بڑے نیتا آئے تھے۔ راسو بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ان کی تقریر سن رہا تھا۔ جب تقریر ختم ہوئی تو نیتا جی نے تالیوں کی گونج میں نمائش کا دروازہ جو مصنوعی پھول پتوں سے سجایا گیا تھا اس کی سنہری ڈوریاں کاٹ دیں۔ پہلے نیتا جی اور ان کے ساتھی نمائش گاہ میں داخل ہوئے ان کے بعد پھر پبلک کو اندر جانے کی اجازت ملی۔

رامو کو اس نمائش کے دیکھنے کا بہت دنوں سے شوق تھا۔ اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی زبانی سُنا تھا کہ اب کے پانچ سالوں کے اندر مزدوروں کو رہنے کے لیے نئے کوارٹر مل جائیں گے۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہوا۔ دوسری چیزوں پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا اس جگہ پر جا کے ٹھہر گیا جہاں مزدوروں کے گھروں کا نمونہ رکھا تھا۔ اس میں ایک کمرہ تھا اور اس میں دو دروازے اور چار کھڑکیاں تھیں۔ آگے برآمدہ تھا اور اس کے سامنے پھول لگے ہوئے تھے۔ دو دو کوارٹروں کے ساتھ ایک باتھ روم اور نل تھا۔ کمرے اور برآمدے میں بجلی کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بلب لگے ہوئے تھے۔ راموں کے قدم اس جگہ پر رُک گئے اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ یہ گھر تو اس کو سورگ معلوم ہونے لگا۔ کتنا آنند ہو گا یہاں۔ من میں شانتی اور یہ سندر گھر۔

ابھی تک تو جہاں وہ رہتا تھا وہاں ایک کھولی میں رات کو بارہ آدمی سوتے تھے۔ تمام دن کی سخت محنت کے بعد رات کو پیر پھیلانے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ اب تو اس کو اس کھولی کی عادت ہو گئی تھی ورنہ جب پہلی رات آیا تھا تو یہاں کا نقشا دیکھ کر وحشت ہونے لگی تھی۔ دروازہ پر بے شمار پان کی پیکوں کے دھبے، پوری کھولی میں آدھی جلی بیڑیوں کے ٹکڑے اور ماچس کی تیلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں سوڈے کی خالی بوتلیں لڑک رہی تھیں۔ گرمی کی شدت اور سنڈاس کی بو سے وہ تمام رات جاگتا رہا تھا۔ بارہ آدمیوں کے گرم گرم سانس اور ان کے بدبودار پسینے سے دم گھٹنے لگا تھا۔ کھٹملوں نے بھی جی بھر کے نئے مہمان کی خاطر کی تھی۔ اس کو اپنے گانو کی شبنم اور چاندنی میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی راتیں یاد آئیں جن میں پکے ہوئے گیہوں اور دھان کی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا میں کل ہی اس کھولی کو چھوڑ کر کوئی دوسری صاف ستھری جگہ تلاش کر لوں گا۔ لیکن دوسرے دن جب نئی جگہ کی تلاش میں نکلا تو اسے مزدوروں کے رہنے کی سبھی کھولیاں پہلی جیسی نظر آئیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گندی اور تنگ و تاریک جن میں سے کبھی سورج دیوتا کے درشن بھی نہ ہوتے تھے۔

یہ صاف ستھرا گھر دیکھ کر اس نے سوچا دو آدمی تو بڑے آرام کے ساتھ اس میں

رہ سکتے ہیں۔ جب یہ گھر مل جائے گا تب میں شانتی سے شادی کروں گا۔ شانتی بھی اسی کی طرح ایک مزدور لڑکی تھی۔ جو گارا مٹی ڈھونے کا کام کرتی تھی۔ دونوں کی سگائی ہو چکی تھی۔ لیکن کھولی نہ ہونے کی وجہ سے وہ ابھی تک شانتی کو دلھن بنا کے اپنے گھر میں نہ لا سکا تھا۔ جس جگہ وہ خود رہتا تھا وہاں شانتی کو کس طرح رکھ سکتا تھا اور نیا گھر لینے کے لیے رامو کے پاس پیسے نہ تھے۔ آج کل تو کھولیوں کے بھاؤ بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ دو ڈھائی ہزار سے کم کی تو کوئی بات ہی نہ کرتا تھا۔ نہ جانے رات کو وہ کتنے سپنے دیکھتا جو صبح ہوتے ہی افشاں کی طرح بکھر جاتے۔ مگر آج اس کے سامنے ان خوابوں کی تعبیر تھی۔ اس سندر گھر میں جب شانتی آجائے گی تو اس کے پیار کی چھاؤں میں جیون کے دکھ بھی سہل ہو جائیں گے۔

"ہمیں یہ گھر کتنے دنوں میں مل جائے گا؟"

"ارے تو بھی آگئی شانتی! سیٹھ نے کیسے چھٹی دے دی؟"

"سیٹھ تو نہ بولتا تھا۔ پر میں آگئی۔ کیا بات ہے ایک دن کے پیسے ہی تو کاٹ لے گا۔ میں نہ آتی تو یہ گھر کیسے دیکھتی۔ اچھا بتا رامو کب تک یہ ہمیں مل جائے گا؟"

"یہ تو بھگوان جانے شانتی!"

جب یہ گھر ہمیں مل جائے گا تب میں اس میں ایک تلسی کا پودا بھی لگاؤں گی۔ اتنا اچھا گھر ملنے کے بعد تو روز بھگوان کی پوجا کرنی ہوگی۔"

رامو شانتی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ یہاں ایک سینی ٹوریم کا نمونہ رکھا تھا ٹی بی کے مریضوں کے لیے۔

"دیکھ رامو! ہماری سرکار کو غریبوں کا کتنا خیال ہے۔ جب یہ بن جائے گا تب ششی کی ماں کو یہاں لاکر رکھیں گے۔ ششی اپنی ماں کی بیماری کے کارن بہت دکھی رہتی ہے!

پھر یہ دونوں باقی چیزوں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ تمام راستے شانتی گھر کے بارے میں ذکر کرتی رہی۔ پوری نمائش میں اس کا دلچسپی کا مرکز صرف یہی گھر تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ رامو اور شانتی اپنے دلوں میں گھر کی آس لیے دوسروں کے لیے نئی

عمارتیں بناتے رہے۔ جب عمارت بن کر تیار ہو جاتی تب اس کے فلیٹ نئے خاندانوں سے آباد ہو جاتے۔ ان میں خوشیاں بکھر جاتیں۔ قہقہے گونجنے لگتے۔ اور اس کے بنانے والے دوسروں کو خوشی دے کر پھر ایک نئی عمارت کی تعمیر میں مصروف ہو جاتے۔

ایک دن شانتی نے راموکو بتایا۔ رات دادا بڑے دمن سے بول رہے تھے میں نے ایک اور لڑکا دیکھا ہے۔ اس کے پاس کھولی بھی ہے اور دھندا بھی بڑا ہے۔ راموکی راہ دیکھتے دیکھتے تو تین چار برس بیت گئے۔ جوان لڑکی کب تک گھر میں بیٹھی رہے گی۔ یہ سنتے ہی راموکے ہاتھ سے اینٹ چھوٹ کر پیر پر گر پڑی۔

"کیا سگائی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ بات میرے تو دھیان میں بھی نہیں تھی۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے راموں نے کہا۔ تم دادا کو بولنا کچھ دن اور ٹھہر جائیں۔ کسی نے مجھ سے کہا ہے کہ پانچ سو روپے دو تو میں تمھیں اندھیری میں کھولی دلا دوں گا۔

"مگر پانچ سو روپے آئے گا کہاں سے؟" شانتی نے پوچھا۔

"اس کی فکر تم مت کرو۔ سیٹھ نیا کارخانہ بنا رہا ہے اس میں رات کو بھی کام کروں گا۔"

سیٹھ جی نے کہہ دیا تھا۔ عمارت ہولی تک تیار ہو جانی چاہیے۔ کام بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ مزدوروں کو ایک منٹ کی بھی چھٹی نہیں تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں راموکو بخار نے آگھیرا۔ وہ اسی بخار کی حالت میں کام پر جاتا رہا۔ کئی بار شانتی کے باپ نے منع بھی کیا۔ مگر وہ نہیں مانا۔ آج کل تو صرف ایک دھن تھی۔ زیادہ سے زیادہ کام کرنا۔ سوچتا تھا کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو میں جلد سے جلد شانتی کو اپنے گھر لے آؤں۔

راموکا بخار تو کچھ دن کے بعد اتر گیا لیکن کھانسی کا سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی کبھی اس کو اپنی چھاتی میں ایک ٹیس سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ سے اپنے سینے کو دبا کر پھر کام شروع کر دیتا۔ ایک دن شام کو جب گھر واپس آیا تو بخار کافی تیز تھا۔ تمام رات وہ چنے کی طرح بھنتا رہا۔ صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی کہ کھانسی کے جھٹکے کے ساتھ راموں نے بہت سا خون اگل دیا۔

"ارے یہ کیا ہے بھیا؟" اس نے اپنے قریب سوئے ہوئے ساتھی کو جھنجھوڑا۔

اس عرصے میں اسے دوسری قے پھر آئی اور سرخ سرخ گرم خون اس کے کپڑوں پر پھیل گیا۔ رامو کا پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کوئی کہ رہا تھا اسپتال لے چلو طاقت کی دوائی ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی کی رائے تھی بخار کی گرمی سے خون آگیا ہے۔ ٹھنڈی چیزیں کھانے کو دینی چاہیے۔ ڈاکٹر تو گرم گرم دوائیں دے کر کلیجے کو پھونک دیں گے۔ گئی برسات میں جب فضلو چاچا نے خون گرایا تھا تب وہ ڈاکٹر کے دو تین انجکشن لینے کے بعد بھی خلاص ہو گئے تھے۔

رامو سب کی رائے سن رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے مرض کی نوعیت سمجھ چکا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ شانتی کے پتا جی کو بلا دو۔ جو ان کی مرضی ہوگی اب وہ ہوگا۔ شانتی کے پتا جی آگئے۔ اور پھر سب کی رائے سے وہ رامو کو قریبی اسپتال میں لے گئے۔ ڈاکٹر نے اس کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے ایک بڑی خوراک 'پلازما' کی دی اور اسکریننگ کر کے ٹی بی تشخیص کر دی۔

ڈاکٹر نے کہا: "اس کو کسی قریب کے سینی ٹوریم میں بھیج دو۔ مرض پرانا ہو گیا ہے۔"

"کیا آپ دوائی نہیں دے سکتے؟" شانتی کے باپ نے پوچھا۔

"ہاں! دے سکتا ہوں۔ مگر سینی ٹوریم کی بات دوسری ہے۔ وہاں مریض کی دیکھ بھال اچھی طرح ہوگی۔ دوا، غذا اور آرام سب کا خیال رکھا جائے گا۔" ڈاکٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر ہم غریبوں کو وہاں کون رکھے گا ڈاکٹر صاحب؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کو بھی وہاں تمام سہولتیں ملیں گی۔ میری رائے میں آپ آج ہی ان کو وہاں داخل کرا دیجیے۔"

رامو کے کچھ ساتھی اس کو بمبئی سے باہر ٹی۔ بی اسپتال لے گئے۔ ہوا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی جراثیم کش دواؤں کی تیز بو، سفید کپڑے منہ پر باندھے ہوئے ڈاکٹر اور نرسیں، سسکتے اور بلکتے ہوئے مریض۔ رامو ایک انجانے خوف سے کانپ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں کے بڑے ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ اور کہا۔

'تم باہر بیٹھو۔ نرس انجکشن دے گی۔ پھر گھر جا سکتے ہو۔'

'مگر بمبئی کے ڈاکٹر نے تو مجھے یہاں بھرتی ہونے کو بھیجا ہے۔ راسو نے لجاجت سے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا: 'ہمارے یہاں آج کل کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ اور تمہارا کیس زیادہ سیریس بھی نہیں ہے' اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ اور جلدی جلدی لوشن میں ہاتھ دھونے لگا۔

راسو باہر آیا۔ یہاں نرس نے انجکشن دیا اور وہ پھر اپنی اسی تنگ و تاریک کھولی میں واپس آگیا۔ مگر دو دن بعد راسو کا بخار پھر بڑھ گیا۔ اور جب وہ دوا لینے ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے دیکھتے ہی پوچھا۔

تم ابھی تک سینی ٹوریم نہیں گئے ہ؟'

'گیا تھا ڈاکٹر صاحب! مگر وہاں میرے لیے جگہ نہیں ہے۔'

ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا: 'تم کام کہاں کرتے ہو؟'

ہم سیٹھ جمنا لال کی نئی بلڈنگ بنا رہے ہیں۔' شانتی کے باب نے جواب دیا۔

'اپنے سیٹھ کے پاس جاؤ وہ کسی ٹی۔بی اسپتال کے ڈاکٹر کے نام چٹھی دلا دیں گے تو پھر تمہیں وہاں بھرتی کر لیا جائے گا۔'

'بھگوان آپ کو سدا سکھی رکھے ڈاکٹر صاحب! میں ابھی ابھی جا رہا ہوں۔' شانتی کے باپ نے کہا۔

راسو گھر پہنچا کر وہ سیدھا سیٹھ کے پاس گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سیٹھ جی بہت مصروف ہیں۔ ان کے نئے کارخانے کا آج ادگھاٹن ہونے والا ہے۔ دو دن بعد کسی سے مل سکیں گے۔ دو دن کا وقت تو بہت ہے۔ نہ جانے راسو کا کیا حال ہو۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ سیٹھ جمنا لال اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ لفٹ سے برآمد ہوئے۔

'نمستے' اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے گردن جھکا دی۔ سیٹھ جی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے بے اعتنائی کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گئے۔

'سیٹھ جی! ایک چٹھی لینی ہے۔' وہ ہاتھ جوڑے ہوئے گاڑی کے قریب آیا۔

لیکن اس کی بات کا جواب دینے سے پہلے موٹر روانہ ہوگئی۔" سیٹھ جی! سیٹھ جی!! میری ایک بات سن لیجیے: وہ تیزی سے بھاگا۔

ایک نوکر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیٹھ جی نے کہہ دیا ہے پرسوں آنا۔ پھر کیوں گاڑی کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟"

"پرسوں بہت دور ہے بھیا! اور میرے رامو کو تو آج ہی اسپتال جانا ہے۔" اسی وقت ایک ساتھی نے آکر بتایا۔ رامو نے پھر بہت سا خون تھوکا ہے۔ تم ابھی چلو چاچا

شانتی کے باپ نے دیکھا رامو نڈھال اپنے بستر پر پڑا ہے۔ وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ رامو نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"مجھے جلدی دواخانے لے چلو۔"

"ابھی لے چلوں گا۔ تم گھبراؤ نہیں بیٹا!" شانتی کے باپ نے بڑے پیار سے کہا۔ پھر سب ساتھیوں نے ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لیے پیسے جمع کیے۔ رامو کے لیے کچھ پھل اور دودھ لائے۔ شانتی کو سیٹھ جی کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے سفارشی چٹھی لکھوا کے لائے۔ اور رامو کو لے کر شہر سے دور ٹی۔ بی اسپتال دوبارہ روانہ ہو گئے۔

اسپتال کے گیٹ پر ڈاکٹر اپنے ایک دوست کے ساتھ بات بات پر قہقہے لگاتا ہوا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

سب نے مل کر رامو کو ٹیکسی سے اتارا۔ اور پھر زمین پر ڈال دیا۔" حضور! اس کی حالت بہت خراب ہے۔" شانتی کے باپ نے کہا۔ ڈاکٹر نے اپنے قریب کھڑی ہوئی نرس کی طرف اشارہ کیا۔ نرس نے کہا: شہر کے جس اسپتال میں علاج کرا رہے تھے۔ پہلے اس کا نام بتاؤ۔ ہم وہاں انکوائری کر لیں پھر بھرتی کریں گے۔"

"اس میں تو بہت سمے بیت جائے گا۔"

"نہیں ہم ابھی فون پر بات کرتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ انکوائری ہوتی رہی۔ رامو اسپتال کے برآمدے میں بے سدھ پڑا تھا۔ دوپہر سے شام اور شام سے اب رات ہو رہی تھی کہ نرس نے آکر کہا۔ آج

ہم نیا پیشنٹ نہیں لے سکتے۔ تم لوگ کل آنا۔"

"اس وقت ہم کہاں لے کے جائیں۔ اس نے پھر بہت سا خون تھوکا ہے۔" شانتی کے باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اب کہاں خون تھوک رہا ہے؟"

اس سخت جواب پر قدرت بھی شرما گئی۔ اور اس نے اپنا دروازہ رامو کے لیے کھول دیا۔ جس کو زندگی میں گھر نہیں ملا۔ اسپتال میں پلنگ نہیں ملا اس کو موت نے بڑھ کر اپنی گود میں لے لیا تھا۔ اور دور سے شانتی کی آواز آ رہی تھی۔ دادا میں سیٹھ سے چھٹی لکھوا لائی۔

صبح جب رامو کی ارتھی شمشان گھاٹ جا رہی تھی۔ ایک اخبار بیچنے والا لڑکا پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔

" نیا پنج سالہ پلان آگیا۔ اب بھارت میں سکھ ہی سکھ ہوگا۔

جراءت

"آؤ۔ آؤ۔ ریحانہ! اتنے دن سے کہاں تھیں؟ میں تو آج تمھیں فون کرنے والی تھی۔"

"کیا بتاؤں شیلا! بازار کے چکر لگاتے لگاتے پیر سوج گئے ہیں۔ آج تھوڑی فرصت ملی ہے تو تمھیں خوشخبری سُنانے آئی ہوں۔"

"کیسی خوشخبری؟ کیا بھیا جی کو کوئی بڑی جگہ مل گئی ہے؟؟"

"بھیا جی کو جگہ تو نہیں ملی ہے ہاں تمھاری زاہدہ کو دولھا مل گیا ہے۔"

"یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ ارے جلدی بتاؤ کیسا لڑکا ہے؟ کہاں تک پڑھا ہے، کیا کام کرتا ہے، کیسا خاندان ہے؟"

"سب کچھ بتا دوں گی۔ تم نے تو ایک سانس میں اتنے سوال کر ڈالے جن کا جواب دینا اس وقت بہت مشکل ہے۔ بس یہ سمجھو تمھاری زاہدہ جیسا ہی لڑکا ہے۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ شادی کے کارڈ تقسیم کرانے چلو۔

"تو کیا بیاہ کا دن ٹھہر گیا؟"

"ہاں شیلا!"

"سگائی بھی ہو گئی۔ بیاہ کا دن بھی ٹھہر گیا اور مجھے ایسا غیر سمجھا کر خبر تک نہیں کی۔

بھلی آدمی ایک فون ہی کر دیا ہوتا۔ میں تم سے بہت خفا ہوں۔ جاؤ میں تمھارے ساتھ نہیں جاتی۔ جیسے اور سب کام چپ چاپ کر لیے ایسے ہی اب کارڈ بھی خود بانٹنے جاؤ۔ مجھ سے کون سا رشتہ ہے جو میں ساتھ میں چلوں؟"

"ارے شیلا رانی! مجھے معاف کر کے پہلے میری مجبوری تو سُنو پھر شکایت کرنا۔ سگائی کرنے کا کہاں وقت ملا ہے۔ بس وہی مثل ہے چٹ منگنی پٹ بیاہ"

"وہ کیسے"

"بتاتی ہوں تم پہلے اپنا غصہ تو ٹھنڈا کرو۔ لاؤ دو گلاس پانی منگواؤ، مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے اور ٹھنڈے پانی سے تمھارا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا"

"پانی کیوں؟ میں تو اس بات پر شربت پلاؤں گی۔ منہ میٹھا کرنے کو"

اچھا تو اب سنو۔ قریب دو ہفتے ہوئے۔ ہم لوگ ایک جگہ دعوت میں گئے تھے۔ وہاں ایک صاحبہ صفیہ بیگم سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ دو ماہ کی چھٹی پر امریکہ سے ہندستان آئے ہوئے تھے۔ ان کا لڑکا رضا وہاں پر ڈاکٹر ہے۔ صفیہ بیگم کو میری زاہدہ بہت پسند آئی۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے پیغام دے دیا۔ رضا بھی بے حد خوبصورت، تندرست اور قابل لڑکا ہے۔ مجھے بھی اچھا لگا۔ اس وقت تو میں خاموش ہو گئی۔ دوسرے روز گھر میں ذکر کیا تو سب نے پسند کیا اور یہ مشورہ دیا کہ یہ رشتہ قبول کر لو۔ آج کل قابل لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ لیکن میں خاندانی حالات معلوم کیے بغیر شادی کے لیے تیار نہیں تھی۔ دوسرے دن ہماری میزبان میرے گھر آئیں۔ انھوں نے کہا۔ صفیہ نے مجھے زاہدہ کے لیے پیغام دینے کو کہا ہے اور آپ لوگوں کی رائے دریافت کی ہے۔ میرے دل میں جو خیال تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اس پر انھوں نے کہا یہ ہمارے دور کے عزیز ہیں اور خاندان وغیرہ کی بہت تعریف کی۔ لہٰذا ہم نے یہ پیام منظور کر لیا۔ اب یہ مشکل درپیش تھی کہ رضا کی چھٹی ختم ہونے میں صرف دو ہفتے باقی تھے لیکن والدین کی خواہش تھی کہ بیٹے کی شادی کر کے بہو کو ساتھ لے کر امریکہ جائیں۔ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ بھی رضامند ہو گئے۔ زاہدہ کے بعد ابھی تین لڑکیاں اور ہیں۔ اگر ایک کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو یہی بڑی بات ہے۔

اب تم ہی سوچو شیلا! اتنے تنگ وقت میں لڑکی کی شادی کی تیاری کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ لڑکے کی شادی کے لیے تو مثل مشہور ہے: بیٹے کی بری بازار میں کھڑی۔ لیکن بیٹی کے لیے تو سو کام کرنے ہیں اور تمھیں تو ہماری مالی حالت کا بھی اندازہ ہے۔ ہر کام کفایت سے کروں گی تب یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔"

"میں نے تو مذاق کیا تھا۔ ابھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ زاہدہ میری بھی تو بیٹی ہے۔ بھگوان نے اپنی کرپا سے یہ شبھ دن دکھایا ہے۔ اب تو اس کو بدا کر کے گھر واپس آؤں گی۔ مگر یہ تو بتاؤ! بیاہ کس تاریخ کو ہے؟

"چار روز بعد بارات آئے گی۔ اللہ! میری زاہدہ کو خوش رکھے۔"

ریحانہ اور شیلا کارڈ تقسیم کر کے خوشی خوشی گھر واپس آئیں۔ اسی دن شام کو خاص خاص لوگوں کو جمع کر کے زاہدہ کو مانجھے بٹھال دیا گیا۔ گرانی اور اپنی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے زاہدہ کے والد حامد صاحب نے اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں کو شادی کے روز مدعو کیا۔ ہاں۔ زاہدہ کی سہیلیاں مانجھے کے روز سے آگئی تھیں۔

چار دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ شام کو بارات آنے والی تھی۔ لڑکیاں صبح سے ڈھولک پر سہاگ گیت گا رہی تھیں:

دیکھو سکھی بنا میرا کیسا ہے دیوانہ

سہاگنیں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ پورا گھر بچّوں کے شور اور قہقہوں سے گونج رہا تھا لیکن ریحانہ اور شیلا۔ ان ہنگاموں سے دور بارات کے استقبال کی تیاری میں مصروف تھیں۔ آج ان دونوں کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ بس یہی فکر تھی لڑکی عزت کے ساتھ رخصت ہو جائے۔

ظہر کے وقت دولھا کے گھر سے دلھن کا جوڑا آیا اور شام ہونے سے قبل سہیلیوں نے زاہدہ کو دلھن بنا دیا۔ چاند سورج کو شرما دینے والا حسن سرخ زرتار جوڑے اور زیور میں اور بھی دمکنے لگا۔ چھ بجے شام کو بینڈ باجے کے ساتھ دھوم دھام سے بارات آئی۔ بارات کی خاطر تواضع کے بعد جب نکاح کی مبارک ساعت آئی اور مولوی صاحب

ایجاب و قبول کے لیے لڑکی کے پاس جانے لگے تب دولھا کے چچا نے آہستہ سے کہا: "آپ پانچ منٹ کے لیے ٹھہر جائیے مجھے حامد صاحب سے ایک ضروری بات عرض کرنی ہے۔"

دوسرے کمرے میں جا کر انھوں نے حامد صاحب سے کہا۔ "دیکھیے قبلہ! ہمارے بھائی صاحب تو امریکہ میں رہ کر اپنے خاندانی رسم و رواج بھول گئے ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ عقد سے قبل آپ کو آگاہ کر دوں۔ ہمارا لڑکا ڈاکٹر ہے اور ہمارے حیدر آباد میں یہ رسم ہے کہ لڑکی والے گھوڑے جوڑے کے نام سے کچھ رقم دیتے ہیں۔ آپ کو کم از کم پچیس ہزار روپے تو دینا ہی چاہیے تب نکاح ہو سکتا ہے۔"

حامد صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا لیکن اپنی گرتی ہوئی حالت کو سنبھال کر بڑی نرمی اور عاجزی سے کہا: "اگر ایسا قاعدہ تھا تو آپ حضرات مجھے پہلے سے بتا دیتے۔ میں اس کا بھی بندوبست کر دیتا۔ اب عین وقت پر تو بہت مشکل ہے۔ چالیس ہزار کا تو میں جہیز دے رہا ہوں۔ یہ جہیز اور لڑکی اب دونوں آپ کی ہیں۔"

"گھوڑے جوڑے کا روپیا جہیز میں شامل نہیں ہوتا۔" دولھا کے چچا نے بے رخی سے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں گھر میں مشورہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔"

حامد صاحب گھبرائے ہوئے پریشان حال بیوی کے پاس گھر میں آئے۔

"بیگم! غضب ہو گیا۔ رضا کے چچا کہتے ہیں ہمارا لڑکا ڈاکٹر ہے۔ پہلے پچیس ہزار روپے دو تب نکاح ہوگا۔"

"ہائے اللہ! اس وقت پچیس ہزار کا انتظام کہاں سے کریں؛ اپنے پاس تو جو کچھ تھا وہ جہیز کی تیاری اور مہمان داری میں صرف ہو گیا۔ اب ان کو اس طرح سمجھائیے۔ اس وقت خیر و خوبی سے شادی کر لیجیے تاکہ ہماری سُبکی نہ ہو اور شادی کے بعد رفتہ رفتہ ہم یہ رقم ادا کر دیں گے۔"

حامد صاحب نے باہر آ کر یہی بات رضا کے چچا کو سمجھائی اور کہا: "اب ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

" بھائی صاحب! زبانی وعدوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ مناسب بات یہ ہے کہ آپ جس گھر میں رہتے ہیں وہ رضا کے نام لکھ دیجیے اور اس پر گواہی کے لیے ہم سب کے دستخط ہو جائیں۔ گھر کا معاملہ ہے آیندہ حساب کتاب ہوتا رہے گا۔ ہم دونوں کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔"

"کیا آپ کو میری بات پر اعتبار نہیں ہے کہ میں شادی کے بعد یہ رقم دے دوں گا؟"

"قبلہ! یہ زبانی وعدے کس کو یاد رہتے ہیں پھر ہماری اور آپ کی زندگی کا کیا اعتبار کب ختم ہو جائے۔ اسی وقت پختہ کام کرنا مناسب ہے۔"

محفل میں چاروں طرف سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آخر نکاح میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے ظاہر کر رہا تھا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ بارات لوٹ جانے کے خوف سے حامد صاحب نے اپنے گھر کا بیعنامہ ڈاکٹر رضا کے نام کر دیا۔ دولھا نے بھی خوش ہو کر اس پر فوراً دستخط کر دیے۔

یہ معاملہ طے ہو جانے کے بعد دولھا کے چچا نے مولانا اور وکیلوں کو دلھن کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت دلھن کے ماموں نے کہا۔ ہماری لڑکی بھی ایم۔ اے پاس ہے لہٰذا ہم ایک لاکھ ایک روپے پر مہر بندھوائیں گے۔ یہ ہمارے خاندان کا دستور ہے۔"

ایک دم چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ڈاکٹر رضا کے والد اور چچا کی آواز گونجی: "یہ رقم ہماری حیثیت سے بہت زیادہ ہے ہم منظور نہیں کر سکتے۔"

"ایک لاکھ مہر پر مجھے شادی منظور ہے۔" دولھا نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوست سے کہا۔ یہ بات میرے والد اور چچا صاحب کو سمجھا دو۔

"ارے واہ صاحب زادے! ایک لاکھ روپے تم مہر میں دے دو گے صرف پچیس ہزار روپے کے عیوض میں؟" میں تمھیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔ چچا غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

"ہم تو تمھاری زندگی بنانا چاہتے تھے لیکن جب تم خود ہی اپنے کو تباہ کر رہے ہو تو

پھر ہم کیوں برے بنیں۔ جائیے مولوی صاحب تشریف لے جائیے۔ ہم لوگوں کی طرف سے اجازت ہے۔ یہ آپ خمیازہ بھگتیں گے۔"

نکاح ہو گیا۔ چھوارے لٹائے گئے اور خاموش محفل میں پھر سے جان آگئی۔ چاروں طرف سے مبارک باد، سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ بزرگ خواتین نے دولھا کو آرسی مصحف کے لیے اندر بلایا۔ لڑکیوں نے ڈھولک پر گیت شروع کر دیا۔

بنا۔ بنی کا طلب گار بنا دل میں ہنسے
بنی گھونگھٹ میں ہنسے اور بنا مقنے میں ہنسے

اس رسم کے ادا ہونے کے بعد زاہدہ نے اپنی والدہ کو بلا کر کہا۔ "امی جان! میں رخصت سے قبل ڈاکٹر رضا سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ اب تو شرعاً وہ میرے شوہر ہیں اور مجھے بات کرنے کا حق ہے۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گی؟"

زاہدہ کی والدہ نے جو اس جھگڑے میں بے ہوش ہو گئی تھیں اور ابھی ہوش میں آئی تھیں۔ بیٹی کی یہ خواہش پوری کر دی۔

"میں اپنا مہر معاف کرتی ہوں۔ میری نظر میں انسان کی عظمت کے مقابلے میں روپے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔" زاہدہ نے نیچی نگاہوں سے کہا۔

" اور میں گھر کا بیعنامہ امی جان کے نام منتقل کرتا ہوں۔ تم جیسی شریک حیات پانے کے بعد مجھے گھر کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔"

شادی کا تحفہ

صبح جب ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا تو اس نے شمسہ کا کارڈوگرام دیکھا پھر دل اور نبض کی رفتار کا معائنہ کیا اور مسکرا کر کہا "گڈ"۔

شمسہ بھی ہنس پڑی۔ اس کے زرد چہرے پر سرخی تو نہیں جھلکی ہاں امید کی چمک ضرور آگئی۔

"اب میں اچھی ہوں نا؟ سانس پھولنے اور دم گھٹنے کی تکلیف بھی کم ہو گئی ہے۔"

"یس"

"ڈاکٹر صاحب! آپریشن کب تک ہو گا؟" اب میں بہت جلد اچھا ہونا چاہتی ہوں۔"

"گڈ۔ ویری گڈ۔"

دوسری ہدایتیں دے کر ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ اور نرس کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ باہر آکر اس نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ اس لڑکی میں WILL POWER بہت ہے۔ ہم لوگوں کو دوسرے پیشنٹ کو تو سمجھانا پڑتا ہے تب تیار ہوتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر نے بلڈ بینک کے ڈاکٹر کو بلا کر پوچھا: "ہمیں جتنے خون کی ضرورت ہے وہ پوری ہو گئی؟"

"جی نہیں ڈاکٹر! ابھی تک صرف تین بوتل جمع ہوا ہے۔ باقی کے لیے کوشش

کر رہے ہیں۔ خون بیچنے والے تو برابر آرہے ہیں مگر وٹامن کی کمی اور چھوت دار بیماریوں کے جراثیم کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں جس گروپ کی ضرورت ہے وہ خون کا گروپ بہت کم ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد شمسہ کی ماں نے سمجھایا "بیٹی! ڈاکٹر سے اس طرح بات نہیں کرتے۔ وہ تمھیں اس قابل سمجھیں گے جب ہی تو ــــــ " آپریشن کا لفظ وہ اپنی زبان سے ادا نہ کر سکیں۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اُن کو چھپانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔

امّی جان! مجھے بہت کام کرنا ہے۔ میں بیمار بن کر زندہ رہنے کو بالکل تیار نہیں ہوں دیکھیے میرے ہاتھ میں کتنی طاقت آگئی ہے۔" اس نے اپنا بایاں نیلا ہاتھ جس میں منگنی کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ سامنے کر دیا۔ ماں نے کمزور ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ شمسہ سوچنے لگی۔ میں نے اور شکیل نے مل کر جو خواب دیکھے تھے اُن کو پورا کرنا ہے۔ وہ اپنی آنے والی رنگین اور خوبصورت زندگی کے تصوّر سے مسکرانے لگی۔

ملاقات کے وقت جب شمسہ کے والد آئے تو وہ اپنے ساتھ شمسہ کے دوستوں اور عزیزوں کے خطوط بھی لائے۔ سب ہی خط انھوں نے پڑھ کر سُنا دیے لیکن ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ جس پر امریکہ کی مہر ثبت تھی۔ بیٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔ عیادت کرنے والوں کے جانے کے بعد شمسہ نے وہ رنگین لفافہ چاک کیا۔

میری شمسہ! ان گنت دعائیں

ابھی تمھارا محبت بھرا خط ملا۔ اگر ڈاکٹر کی رائے آپریشن کی ہے تو ضرور کرا لو۔ آج کل سرجری نے اس قدر ترقی کی ہے کہ دل کا آپریشن بہت معمولی کام ہو گیا ہے اور تم تو پہلے ہی سے بہت مضبوط دل و دماغ کی لڑکی ہو آج تو کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جن کے سینے کے اندر "پیس میکر" نصب کر دینے سے دل کی حرکت قائم رہتی ہے اور وہ اپنے سب کام انجام دے سکتے ہیں۔ دیکھو! شمسہ تیس تیس سال قبل ہمارے بزرگ اس بات کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسان کا دل مشین کے ذریعے حرکت کر سکتا ہے۔ تمھارا تو

بے حد معمولی سا کام ہے۔ ڈاکٹر بہت جلد تندرست کردیں گے۔

تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ یاد ہے؟ جب ہم لوگ اسکول کے زمانے میں۔ این۔ سی۔ سی میں تھے۔ تم نے ایک خودکشی کرنے والی عورت اور اُس کے بچّے کی جان بچائی تھی۔ ہم لوگ جوگیشوری سے بمبئی واپس آرہے تھے۔ پلیٹ فارم پر لوکل ٹرین کے انتظار میں ایک عورت بھی کھڑی تھی جیسے ہی سامنے سے ٹرین آتی ہوئی نظر آئی وہ عورت مع بچّے کے پٹری پر کود گئی۔ اُسی سرعت سے تم بھی کود گئی تھیں اور اس عورت کو گھسیٹ کر لائین سے الگ کر دیا تھا۔ اسی وقت تیز رفتار انجن سیٹی دیتا ہوا اس جگہ سے گزر گیا تھا۔ اگر ایک لمحہ کی دیر بھی ہو جاتی تو اُس عورت اور بچّے کے ساتھ تم بھی کچل جاتیں۔ تمھاری اس ہمّت اور انسانی ہمدردی سے متاثر ہو کر اسکول کی طرف سے انعام ملا تھا۔ تمھاری اس بہادری پر مجھے آج بھی ناز ہے۔ ایسی بہادر شمسہ جس نے اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دو جانیں بچائی تھیں۔ وہ آج اپنی زندگی کی بھی حفاظت کرے گی۔ یہ تو تم جانتی ہو۔ انسان کی قوت ارادی اُس کو مرض سے بڑی جلدی نجات دلاتی ہے۔ میری شمسہ! بھی اپنا آپریشن اُسی قوت ارادی کے ساتھ کرائے گی کہ مجھے جلد از جلد اچھا ہونا ہے۔

اپنے کمرے کو تازہ گلابوں سے سجایا کرو۔ پھولوں کی خوشبو تمھیں بھی تر و تازہ رکھے گی۔ دیکھو ننھی کلیاں جس طرح کھل کر پھول بنتی ہیں اسی طرح ایک دن تمھیں بھی پھول بننا ہے۔

شمسہ پیاری! تم تو سوشل ورکر کا کورس کر رہی تھیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد ہزاروں مجبوروں اور بیکسوں کے مسائل حل کرنے ہیں۔ ان کو مدد دینی ہے۔ نیک ارادے رکھنے والوں کا خدا بھی ساتھ دیتا ہے۔

میری شمسہ! ہزاروں میل کی دوری کے باوجود تم مجھے ہر وقت اپنے قریب سمجھنا چند مجبوریوں کے باعث میں اس وقت آ نہیں سکتا۔ کتنا لمبا فاصلہ ہے۔ امریکہ اور ہندستان میں؟ جب آپریشن کی تاریخ طے ہو جائے تو مجھے ٹرنک کال کرا دینا۔

منگنی کی انگوٹھی میری انگلی کی زینت ہے اور روانگی کے وقت تم نے جو مسکراتی

ہوئی تصویر دی تھی وہ میری میز پر سجی ہوئی ہے۔ خدا کرے میں تمہیں ایسا ہی مسکراتا ہوا دیکھوں۔ مجھے امید ہے میری باہمت شمسہ اسی طرح مسکراتی ہوئی آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گی

اچھا اب رخصت۔ ہزاروں دعاؤں اور پیار کے ساتھ۔

تمہارا اپنا شکیل

شمسہ نے مسکراتے ہوئے خط کو کئی بار پڑھا پھر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ رات ۱۰ بجے جب نرس دوا کی آخری خوراک دینے کو آئی اور دوا کا پیمانہ لبوں سے لگانا چاہا تب شمسہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیا؛ "سسٹر! اب میں دوا اپنے ہاتھ سے پیوں گی۔ میری طبیعت اچھی ہے۔"

"گڈ۔ آپ میں طاقت جلدی آ رہا ہے۔"

"جب طاقت آ رہی ہے تو آپریشن میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟ دو ماہ ہو گئے بستر پر لیٹے ہوئے اب تو میں اس زندگی سے تھک گئی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھتی ہوں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ آپ جواب دیجیے سسٹر؟"

"پلیز کم بولو۔ آپ بہت جلدی گھر جائے گا۔"

اس جواب پر وہ مسکرا دی۔ نرس نے بجلی بند کر دی۔ زیرو پاور بلب کی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔

شمسہ آنکھیں بند کر کے نیند لانے کی کوشش کرنے لگی لیکن ہوا کے جھونکوں کے ساتھ رات کے سناٹے میں کہیں سے سہاگ گیت گانے کی ہلکی آواز آ جاتی تھی۔ شکیل کا خط، دردِ دل اور سہاگ گیت؛ ان خیالوں میں ڈوب کر خدا جانے کب سو گئی۔

اسپتال سے قریب بلڈنگ میں ایک لڑکی ورشا کی شادی ہونے والی تھی۔ صبح دولھا والے لڑکی کے ابٹن لگانے آئے تھے۔ اس وقت ورشا زرد سلک کی ساری جس کا سرخ رنگ کا زری بوڈر تھا۔ پہنے ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سہیلیاں ہاتھ میں مہندی لگا رہی تھیں اور ساتھ میں گا رہی تھیں ؎

بنو جھکی جھکی جانا سسرال گلیاں

تم کو مہندی لگائیں گی ایسی سکھیاں
جن کے گورے گورے ہاتھ لمبی انگلیاں
تم کو زیور پہنائیں گی ایسی سکھیاں
جن کی بڑی بڑی آنکھیں نشیلی انکھیاں
بنو جھکی جھکی جانا سسرال گلیاں
تم کو دلھن بنائیں گی ایسی سکھیاں
جن کے گھونگھریالے بال رسیلی انکھیاں
بنو جھکی جھکی جانا سسرال گلیاں

"ارے واہ ہماری دیدی تو ابھی سے دلھن لگ رہی ہیں" ورشا کے چھوٹے بھائی راجو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ورشا کی سہیلیوں سے مخاطب ہوا: "کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے، کسی کو ڈھنگ سے گانا بھی آتا ہے؟ اب میں ریڈیو کھول رہا ہوں مقابلہ ہو جائے۔ دیکھتا ہوں تمھارے گیت زیادہ اچھے ہیں یا ہمارے فلمی گانے؟"

"چلو بھاگو یہاں سے ہمارے گانوں کا ریڈیو سے کیا مطلب۔ کیا تم کہ آئے ہو کر ورشا کی شادی ہو رہی ہے؟" ایک سہیلی نے تیزی سے جواب دیا۔

راجو نے ریڈیو کھول دیا۔ اس وقت فرمائشی گیتوں میں اتفاق سے یہ گانا آرہا تھا۔

بنو کے ہاتھ لگی مہندی گھونگھٹ کوئی آکر اٹھادے
ہاں ہاں گھونگھٹ کوئی آکر اٹھادے
اک اک دن گنا اس دن کی خاطر
بچپن سے تھا انتظار
بنو کے ہاتھ لگی مہندی گھونگھٹ کوئی آکر اٹھادے
ہاں ہاں گھونگھٹ کوئی آکر اٹھادے

لڑکیاں ڈھولک چھوڑ کر تالیاں بجانے لگیں۔ ہاہا جی۔ راجو ہار گیا۔ ہمار جیسا گانا ریڈیو پر آرہا ہے۔ گانا پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ یکایک خاموشی چھاگئی۔ کچھ عرصے کے

بعد اناؤنسر کی آواز گونجی:

"ہم بمبئی کے مشہور سرجنوں کی اور سے آپ سب بھائی بہنوں سے اپیل کر رہے ہیں. ایک لڑکی جس کے دل کا آپریشن ہونے والا ہے. اس کو A گروپ خون کی ضرورت ہے. انسانیت کے ناطے آپ لوگ کل خون دینے آئیں. یاد رکھیے A گروپ، A گروپ، A گروپ"

پانچ چھے مرتبہ ٹھہر ٹھہر کر ریڈیو پر یہ اعلان ہوا ہنسی اور قہقہوں کا یہ طوفان جس سے کمرہ گونج رہا تھا تھم گیا. سب لڑکے، لڑکیاں خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے.

"میرا پرس کھولو. اس میں سے نوٹ بک نکال کر اس کا پہلا پیج مجھے دکھا دو." ورشا نے اپنی سہیلی نرملا سے کہا.

رات ورشا نے بڑی کشمکش میں گزاری. بھگوان جانے گھر والے جانے کی اجازت بھی دیں گے یا نہیں؟ مگر میرا فیصلہ اٹل ہے میں ضرور جاؤں گی. نہ جانے اس لڑکی کے من میں کیا کیا ارمان ہوں گے؟ کتنے سندر سپنے دیکھے ہوں گے جیون کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے؟ اس بیماری نے بچاری کا راستہ روک لیا. ایک لڑکی کے من کی خواہش کو دوسری لڑکی ہی سمجھ سکتی ہے. انسانیت کے ناطے تو سب کی جان بچانی ضروری ہے مگر کیا خبر یہ میری دوست شمسہ ہو. وہ بھی تو آج کل اسپتال میں داخل ہے اور اس کا بھی آپریشن ہونے والا ہے. میں اس کو بھی وہی خوشی دوں گی جو مجھے ملنے والی ہے.

دوسرے روز صبح زرد ساری اور مہندی رچے ہاتھوں سے ورشا اور نرملا بلڈ بینک پہنچ گئیں. انھوں نے دیکھا لائن میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں. ایک ڈاکٹر سب کا تھوڑا تھوڑا خون ٹیسٹ کر رہا ہے.

ورشا نے اپنا کارڈ ڈاکٹر کے سامنے کر دیا. دیکھیے میرا A گروپ ہے. آپ کے کام آسکتا ہے. ہم دونوں رات ریڈیو پر آپ کی اپیل سن کر آئے ہیں.

لائین میں بیٹھا ایک شخص بڑبڑانے لگا: "اپن کے پاس کوئی دھندا نہیں تھا. سال دس روپے ملنے کو تھا وہ بھی مارا گیا. اب آج رات بھی ٹھرا پینے کو نہیں ملے گا."

"یہ تو اپن کے منہ سے روٹی چھین لینے کے برابر ہے. کھاتے پیتے گھر کی لڑکیاں بھی

خون بہنے لگیں۔ اپن کی تو چھٹی ہو گئی۔"

"ارے یار! میں تو اندھیری سے آ رہا ہوں۔ میرا بچّہ بیمار ہے۔ سوچا تھا۔ دس پندرہ روپے مل جائیں گے تو ڈاکٹر کی فیس اور بچّے کی دوا آجائے گی۔" تیسرے آدمی نے کہا۔

ڈاکٹر نے کارڈ کو دیکھا۔ ورشا کے کنگنا بندھے اور تازہ تازہ مہندی کے نقش نگار نے ہاتھوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

ورشا سمجھ گئی "ڈاکٹر صاحب! جلدی میری شادی ہونے والی ہے۔ میں چاہتی ہوں نیا جیون شروع کرنے سے پہلے کسی اور کو بھی نئی زندگی دے دوں۔ کیا پتا اس کی بھی شادی ہونے والی ہو۔ بجھتے ہوئے چراغ کو بچانا اچھا شگن ہے۔ اور میری طرف سے اس کے لیے یہ شادی کا تحفہ ہے۔

فٹ پاتھ کا چراغ

یہ تقریباً بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں روزانہ اپنے کام کے سلسلے میں صبح آٹھ بجے جاتی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے گھر آتی پھر شام کو چار بجے جاکر رات کے آٹھ، نو بجے گھر واپس آتی تھی۔

میرے راستے میں جو فٹ پاتھ تھے وہ رات کو تو سب ہی آباد نظر آتے تھے لیکن دن میں خالی ہو جاتے تھے۔ اُس کے رہنے والے صبح اُٹھ کر ایرانی کے ہوٹل میں چائے پی کر اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ تھوڑی دور آگے چل کر ایک کورٹ بنا ہوا تھا۔ اُس کا فٹ پاتھ بھی کافی چوڑا تھا۔ وہاں ایک خاندان رہتا تھا۔ دو میاں، بیوی اور چار بچّے۔ مجھے ان کا طرزِ زندگی بالکل الگ نظر آتا تھا۔ صبح جاتے وقت میں دیکھتی وہ عورت چائے بناتی ہوتی۔ بچّے ہاتھ منہ دھوکر بڑے تمیز سے برابر بیٹھے ہوتے۔ چائے بناکر وہ عورت ردّی اخبار بچھا دیتی اور اُس پر فی آدمی کے حساب سے دس پیسے والی پاؤ رکھ دیتی (اس زمانے میں پاؤ دس پیسے میں ملا کرتی تھی۔) پھر معمولی قسم کی چائے کی پیالیوں میں چائے بناکر بچّوں اور شوہر کو دیتی اور خود بھی شریک ہو جاتی! اس طرح یہ خاندان صبح کا ناشتہ کرتا تھا اور لوگوں کے مقابلے میں مجھے ان کی یہ سلیقہ مندی بے حد پسند آئی۔ میں کسی نہ کسی بہانے رُک کر اُس جگہ میں اُس عورت کو کام کرتے دیکھتی پھر آگے بڑھ جاتی۔

رات کو جب واپس آتی تھی تو اُس وقت مجھے فٹ پاتھ ایک سلیقہ مند عورت کا گھر نظر آتا تھا۔ کورٹ کا جو احاطہ تھا اس کی دیوار پر کیلیں لگا کر تختے لگا دیے تھے۔ اُن پر دُھلے

ہوئے صاف ستھرے برتن رکھے ہوتے۔ قریب ہی ایک کلنڈر لگا ہوتا۔ اُس کے نیچے کھانا پکانے کا اسٹوو ہوتا۔ اُس پر اکثر وہ کھانا پکاتی نظر آتی تھی۔ قریب ہی میں لوہے کی تپائی پر کورے گھڑے میں پانی بھرا ہوا رکھا ہوتا۔ گھڑے کے منہ پر سفید کپڑا بندھا ہوا ہوتا۔ اگر گرمی کا موسم ہوتا تو گھڑے پر بیلے کے پھولوں کا گجرا پڑا ہوتا۔ اوپر دیوار پر بھگوان کی تصویر اور گھڑے کے نیچے شیشے کے پھول دار گلاس رکھے ہوئے ہوتے۔ کھانا کھانے کی پلیٹیں بھی سستے قسم کی چینی کی ہوتی تھیں۔ جس طرح صبح چائے ناشتہ کرتی تھی اسی طرح پرانے اخبار بچھا کر وہ سب کو کھانا کھلاتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد سب لوگ ہول ڈول کھول کر اپنے اپنے بستر بچھاتے بستر بھی صاف ستھرے ہوتے تھے۔ دونوں میاں، بیوی تو بستر پر لیٹ کر باتیں کرنے لگتے اور بچے بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر ہوم ورک کرتے۔

جب کہ میں دوسروں کو دیکھتی تھی کہ وہ رات کو اپنا وقت تاش کھیلنے اور لڑائی جھگڑے میں گزارتے تھے۔ یہ سب باتیں میں مختلف اوقات میں دیکھا کرتی تھی۔

کچھ دن تک وہ عورت مجھے نظر نہیں آئی۔ اس کی جگہ اُس کے شوہر کو کام کرتے ہوئے دیکھتی۔ ایک روز جب میں وہاں سے گزر رہی تھی تو دیکھا وہ عورت کھانا پکا رہی تھی اور گود میں گول مٹول خوبصورت سا ننھا بچّہ تھا۔

گرمیاں گزر گئیں تھیں اور برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ حصّہ نشیبی تھا اس لیے وہاں بڑی جلدی پانی بھر جاتا تھا۔ اگر پوری رات بارش ہوتی تھی تو صبح گھٹنوں گھٹنوں پانی سڑک پر جمع ہو جاتا تھا۔ جب رات کو تیز بارش ہوتی تھی تو میرے دل میں اکثر اس خاندان کا خیال آتا۔ نہ جانے اس وقت وہ لوگ کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟

ایک دن میں نے دیکھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور وہ خاندان فٹ پاتھ کے سامنے والی دکان کے زیرِ سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ عورت کی گود اُس پھول سے بچے سے خالی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ اُس روز اُن کے اُترے ہوئے چہرے دیکھ کر مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔ میں نے پوچھا: "تمہارا بچّہ کہاں ہے؟"

"گزر گیا بائی!" اُس نے جواب دیا۔

"ارے وہ تو بڑا پیارا اور تندرست تھا۔ کیا ہوا تھا؟"

"ایک رات برسات میں بھیگ گیا۔ پورا بدن جلنے لگا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ وہ بولا نمونیا ہو گیا اسپتال لے جاؤ۔ میں اسپتال لے گئی پر اوپر والے کی مرضی کے آگے کوئی دوا کام نہ آئی۔"

"بارش میں کیسے بھیگ گیا؟"

"آپ دیکھتی ہیں۔ ہم سب فٹ پاتھ پر رہتے ہیں۔ جب برسات گرتی تھی تو یہ سامنے والی بلڈنگ کے دادر کے نیچے سر چھپانے کو جگہ مل جاتی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے اوپر سیٹھ کے گھر میں چوری ہو گئی۔ سیٹھ بولا۔ سالا تم سب ہمارا دادر چھوڑو تم سب چور ہو۔ آپ کو معلوم ہے بائی! ہم سب کو رے کر یہاں بیٹھ گیا۔ جہاں آپ دیکھ رہی ہیں۔ کیا کرتا۔ برسات پھر گری اس میں ہم سب لوگ بھیگے پر وہ دو مہینے کا تھا نمونیا ہو گیا"

"تم کہیں اور چلی جاتیں! یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے۔"

"کہاں جاتا بائی! سب سیٹھ لوگ بھگاتا ہے۔ پاپ ایک آدمی کرتا ہے۔ دکھ سب کو جھیلنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی نمونیا ہو کر ایک لڑکا دو برس پہلے بھی خلاص ہوا تھا۔"

"تمھارا آدمی کیا کام کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فیکٹری میں۔"

"اور پگار کیا ملتی ہے؟"

"ساڑھے تین سو!"

"تم کیا کام کرتی ہو؟"

"چار، چھے گھر میں باسن دھونا۔ جھاڑو کھٹکا کرنا۔ ٹائم ملا تو کپڑے بھی دھوتی ہوں۔"

"تمھیں مہینے میں کتنے پیسے مل جاتے ہیں؟"

"سو سے اوپر مل جاتا ہے بائی!"

اُس زمانے میں چار، پانچ سو روپے کافی قیمت رکھتے تھے۔ میں نے کہا: "جب تم دونوں مل کر اتنا کما لیتے ہو تو پھر ایک کھولی لے لو۔ اُس میں بچوں کی جان تو بچ جائے گی۔"

"تم ٹھیک بولتا ہے بائی! پر کھولی کا بھاڑا بہت ہے۔ ہم اپنے بچّوں کو انگلش اسکول میں پڑھاتا ہے۔ وہ ہماری طرح فٹ پاتھ پر نہیں رہیں گے!"

"بہت اچھا خیال ہے۔ تم کھولی میں رہ کر بھی بچّوں کو پڑھانا؟"

"نہیں بائی! پھر اسکول کی فیس کہاں سے بھریں گے؟ انگلش اسکول کا تو ڈریس بھی الگ ہوتا ہے۔ پھر پڑھنے والے بچّوں کو کھانا پینا بھی اچھا منگتا ہے۔ ہمارا سارا پیسا تو کھولی کی پگڑی اور بھاڑے میں چلا جائے گا۔ یہاں بس برسات کی تکلیف ہے۔ ویسے فٹ پاتھ پر بہت آرام ہے۔"

"تم چاروں بچّوں کو انگلش اسکول میں پڑھا رہی ہو؟"

"ہاں بائی! بڑا والا چھوکرا تو ایس۔ ایس۔ سی میں ہے۔"

"یہ بڑا اچھا کام کر رہی ہو" میں نے کہا۔

میرا تو وہ راستہ ہی تھا۔ آتے جاتے ان لوگوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ اگر کبھی جلدی میں گزر جاتی تو دوسرے دن وہ عورت مجھ سے خیریت پوچھتی۔

ایک روز اُس نے مجھے انگریزی کا اخبار دکھایا۔ "دیکھو بائی! میرا بڑا چھوکرا فسٹ آیا ہے!" اخبار میں لڑکے کی تصویر بھی چھپی تھی اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفہ بھی ملا تھا۔

"بائی سب لوگ بولتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھنے کے لیے چھوکرے کو کچھ پیسے بھی دے گی! کیا یہ بات برابر ہے؟"

"ہاں پیسا ملے گا۔ تمھارا بیٹا بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے۔"

اُس نے پیڑے کا ڈبا میرے سامنے کر دیا۔ "لو بائی! منہ میٹھا کر لو۔" میں نے اُس کو مبارک باد دی۔

پھر میں نے وہ کام چھوڑ دیا اور میرا اُس طرف جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ ہاں جب بارش کے موسم میں شدید بارش ہوتی تھی تو ذہن کے اُفق پر اُن کی یادوں کے ستارے جگمگانے لگتے تھے۔

ابھی دو تین سال قبل کی بات ہے۔ میں جوہو سے وارڈن روڈ بس سے آ رہی تھی

ایک اسٹاپ پر بس رکی اور ایک کافی صحت مند عورت قیمتی ساری پہنے میرے برابر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ گلے میں لمبا سا سونے کا منگل سوتر تھا۔ کانوں میں ٹوپس اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیوں کے اِدھر اُدھر چوڑی چوڑی سونے کی چوڑیاں پہنے تھی۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ صورت کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی۔

وہ پھر مخاطب ہوئی "بائی! نہیں پہچانا میں کون ہوں، اتنی جلدی بھول گیا؟"

مجھے اپنے بھول جانے پر شرمندگی ہو رہی تھی باوجود کوشش کے یاد نہیں آرہی تھی کہ یہ کون عورت ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا: "صورت تو نہیں بھولی ہاں آپ کا نام یاد نہیں آرہا!"

"یاد ہے؟ ہم فٹ پاتھ پر رہا کرتے تھے اور آپ وہاں سے روز جایا کرتی تھیں!"

"اچھا۔ اچھا۔ تم ہو؟" میں نے اُس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ صورت، صحت، اور لباس سب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"کہاں سے آرہی ہو؟ تم تو بالکل بدل گیئں۔ اسی لیے مجھے پہچاننے میں مشکل پڑی۔

وہ ہنس پڑی: "اندھیری سے آرہی ہوں بائی! میرا لڑکا بہت بڑا انجینئر ہو گیا ہے"

"کہاں! میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ایک کمپنی ہے اُس میں انجینئر ہے۔"

"کون سی کمپنی؟"

وہ پھر ہنسی: "نام تو میرے کو یاد نہیں رہتا۔ ہاں بہت بڑی کمپنی ہے۔ کمپنی کی طرف سے بڑا سا بنگلہ بھی ملا ہے۔ فرج ہے، فون ہے اور اس میں بڑا بڑا روم ہے۔ سونے کا کمرہ ایر کنڈیشنڈ ہے۔ بائی! میرے کو تو اُس روم میں نیند نہیں آتی بہت ٹھنڈک رہتی ہے!"

"بہت خوشی ہوئی مجھے یہ بات سن کر۔ تمہارا دوسرا لڑکا کیا کام کرتا ہے؟"

"وہ بزنس کا دھندا کرتا ہے۔ دونوں چھوکری بینک میں کام کرتی تھیں۔ اُن کی شادی

بنا دی۔ آپ کا ایڈریس نہیں معلوم تھا۔ اس لیے کارڈ نہیں بھیجا۔"

"اور اب تم دونوں کہاں رہتے ہو؟ میں نے پوچھا۔

اپنے بڑے چھوکرے کے پاس۔ اس کی عورت ہماری بہت سیوا کرتی ہے۔ دو نوکر بھی ہیں بائی! گاڑی بھی ہے۔ بھگوان نے سب کچھ دے دیا ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے بڑا سا گارڈن بھی ہے۔

اتنے میں اگلے اسٹاپ پر بس رک گئی اور وہ عورت نمستے کر کے اتر گئی۔

سمجھوتہ ایکسپریس

امرتسر اسٹیشن کی چہل پہل آج کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ گیارہ برس بعد میرے لیے پھر سے راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ پرانہ گرد و غبار جھاڑ کر نئے رنگوں سے سنوارا گیا ہے۔ اس نئی سج دھج کے ساتھ میں انسانوں سے بھری ہوئی کھڑی ہوئی ہوں حالانکہ اپنوں کا کبھی بوجھ نہیں پڑتا وہ تو ہمیشہ پھول کی طرح ہلکے معلوم ہوتے ہیں اور واقعی یہ محبت کے ایسے پھول ہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک پیار کی خوشبو پھیلانے جا رہے ہیں۔ کچھ نئی شکلوں کے لوگ میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کوئی خوشی سے بیتاب ہو کر کہتا ہے ؎

میرا سلام اے جال ہور جانے والی

کسی نے پیار سے میرے اوپر ہاتھ پھیرا۔ "ہے بھگوان! یہ شبھ گھڑی اپنے جیون میں دکھا دی۔"

"کتنی دیر میں گاڑی روانہ ہو گی؟" سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں۔

"ارے بھائی! تمھاری بے چینی سے ٹائم تھوڑی بدل جائے گا۔"

"گارڈ تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہا،" کسی نے جھانک کر دیکھا۔

اسی وقت مجھے چلنے کا اشارہ ملا۔ اور میں نئے سجے سجائے راستے سے منزل کی جانب بڑھنے لگی۔ آج میرا بھی حوصلہ بلند ہے۔ مجھے کسی راہزن کا کھٹکا نہیں ہے۔ جیسے جیسے

منزلیں طے کر رہی ہوں نگاہوں میں بیگانگی کی جگہ اپنائیت اور بے مروتی کی جگہ محبت کے پیام مل رہے ہیں۔ برسوں کے انتظار کے بعد مجھے خوش آمدید کہنے والے جس بے قراری سے ایک ایک منٹ گن رہے ہیں اس کا اندازہ مجھے روانگی سے قبل ہی ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی تھی حالانکہ یہ لاہور کا اسٹیشن میرا دیکھا بھالا ہے لیکن مدت کی جدائی کے بعد اب آئی ہوں تو ایک قسم کی اجنبیت سی محسوس ہو رہی ہے۔ نیا ملک، نیا شہر اور نئے لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے میں اور بھی آہستہ چلنے لگی۔ میری گود میں بیٹھے ہوئے لوگ بے قراری اور بیتابی سے جھانک کر دیکھنے لگے۔

کوئی جلدی جلدی رومال ہلانے لگا۔" دیکھو۔ دیکھو لاہور کا اسٹیشن آگیا۔" کسی نے ہاتھ اٹھا کر اپنے عزیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں جانب خوشی سے چہرے تمتماتے ہوئے تھے اور آنکھوں کے جام چھلک رہے تھے۔ ایک پیاری سی لڑکی سیاہ برقعہ میں لپٹی ہوئی پوچھ رہی تھی: "خالہ جان! میں تو بھیا کو نہیں پہچان سکوں گی۔ کیا آپ پہچان لیں گی؟" "ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اپنا خون تو ہزاروں میں پہچان لیا جاتا ہے۔ وہی چاند سی صورت ہوگی۔ اگر کوئی فرق ہوا ہوگا تو صرف اتنا اُس کے کالے ریشم کے لچھوں جیسے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے ہوں گے۔"

"میں تو دو برس کی تھی جب بھیا گئے تھے۔"

"جب بہن کو گود میں لیے پھرتا تھا۔ اب گلے سے لگائے گا۔"

ستر، اسّی سالہ ظہور میاں کہہ رہے تھے: "اب موت کسی بھی وقت آئے کوئی غم نہیں ہے۔ آج میں اپنے برسوں کے بچھڑے ہوئے بیٹے سے مل لوں گا۔" انھیں کے ہم عمر ایک صاحب بولے۔ اپنا تو یہ حال ہے ؎

دیارِ ہیر کی یادوں سے دل جلائے ہوئے
چناب و جہلم، راوی سے لو لگائے ہوئے

کلونت کور نے اپنی پگڑی سر پر رکھی اور میرے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔

"بھاگیہ وان! تو نے گرو نانک کی جنم بھومی کے دوبارہ درشن کرا دیے۔" اُسی

وقت کسی نے پیچھے سے آکر گردن میں ہاتھ ڈالا، ارے. تو آگیا کلونت کور! میرے یار!"
"تیرے بنا چین کہاں تھا الٰہی بخش!" اور دونوں گلے مل کر کھلکھلا کر ہنسنے لگے.
اس قدر ہجوم تھا کہ اس سے آگے کا منظر میں نہیں دیکھ سکی. ہاں اس بات پر فخر تھا کہ آج میں نے بچھڑے ہوئے کو ملا دیا اور اس خیال سے جو سکون قلب حاصل ہوا وہ اس سے پہلے نصیب نہیں ہوا تھا. کچھ ہی دیر بعد میری واپسی کی تیاری شروع ہوگئی. اس وقت میری گود بڑی انوکھی گود بن گئی تھی. بچوں کی طرح نوجوان اور ضعیف بھی میرے آنچل کی چھاؤں میں آگئے تھے اور میں نے ماں کی طرح سب کو سینے سے لگا لیا تھا. یہ کوئی غیر نہیں اپنے ہی تو ہیں. ایک عرصے سے بچھڑے ہوئے تھے آج آئے ہیں تو میرا کام بھی ان کو سنبھال کر لے چلنا ہے. ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو میری گود میں پہلے بھی بیٹھ چکے ہیں. بس فرق اتنا ہے جو جوان تھے وہ سن رسیدہ ہو گئے ہیں اور بچے جوان نظر آرہے ہیں. میں نے دیکھا ایک جوان آدمی سوٹ کیس لیے میری جانب آرہا ہے. اس کے ساتھ میں ایک ضعیف شخص ہے جو رُک رُک کر چل رہا ہے. شکلوں سے دونوں باپ بیٹے معلوم ہو رہے تھے. جب میرے پاس آگئے تو قلی نے باقی سامان رکھ دیا اور دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے. جوان آدمی کے ہاتھ میں ابھی تک سوٹ کیس تھا.

"بیٹا! اپنا گھر تو پہچان لوگے؟"

"ہاں. ہاں. کیوں نہیں" بیٹے نے بڑے اعتماد سے جواب دیا.

"بہت عرصہ ہو گیا. نہ معلوم کیا کیا تبدیلیاں ہو گئی ہوں گی؟ کون اس گھر میں رہتا ہوگا یہ بھی تو خبر نہیں؟"

"مگر کچھ چیزیں ایسی ہیں ابا جان! ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی. گھر کے قریب تالاب کے کنارے وہ برگد کا بوڑھا درخت تو ضرور ہوگا. بچپن میں ہماری پڑوسن کی لڑکی ریشما جھولا ڈال کر جھولا کرتی تھی"

"تم نے ٹھیک یاد دلایا بیٹا! پھاٹک کے سامنے والی مسجد جس میں نماز پڑھنے میرے ساتھ تم بھی جایا کرتے تھے. اس کے مینارے تو اس قدر بلند ہیں کہ شہر میں داخل ہونے پر

سب سے پہلے وہی نظر آتے تھے۔ بس اس مسجد کو دیکھ کر تمھیں گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"جی ہاں۔ ابا جان! یہ نشانیاں تو ضرور باقی ہوں گی۔"

اس وقت جو لوگ اُس گھر میں رہتے ہوں۔ اُن سے میرا سلام کہنا اور کہنا میرے بوڑھے باپ نے آپ سے ایک درخواست کی ہے وہ یہ کہ ہمیں گھر کے سامان میں سے کچھ نہیں چاہیے بس میرا تصویروں والا البم ضرور دے دیجیے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ تمھیں تو یاد ہوگا میرے کمرے میں جہاں نماز کی چوکی تھی اس کے برابر والی الماری میں وہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں تمھاری ماں کی تصویریں ہیں جو میں نے شادی کے دن سے لے کر انتقال سے کچھ عرصے پہلے تک کی محفوظ کر دی تھیں اگر یہ سرمایہ مجھے مل جائے تو زندگی کے باقی دن بڑے سکون کے ساتھ گزر جائیں گے۔

"امی جان کی تصویریں حاصل کرنے کی تو میں ضرور کوشش کروں گا۔"

"ایک کام اور کرنا۔ دیکھو بھولنا نہیں۔ لالہ بدری پرشاد میرے بچپن کے دوست ہیں۔ اب تو وہ بھی میری طرح بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ تم وہاں پہنچنے کے بعد فوراً ایک ٹوکری پھلوں کی اور کچھ بادام میری طرف سے تحفے میں دے دینا۔ ہاں! اچھا عین وقت پر یاد آگیا۔ شب جمعہ گھر کی سامنے والی مسجد میں پانچ چراغ روشن کر دینا۔ میں نے بچپن سے لے کر جب تک وہاں رہا پابندی سے چراغ روشن کیے ہیں۔

"جی ہاں! چراغ بھی روشن کر دوں گا۔"

"بیٹا! مجھے یوں اطمینان نہیں ہوگا۔ آج کل کے جوانوں کی یادداشت ہماری جیسی نہیں رہی۔ تم میری سب ہدایتیں نوٹ بک میں درج کر لو۔"

بیٹا مسکرانے لگا۔ اُس نے اپنی پتلون کی جیب سے نوٹ بک نکالی اور باپ کی بتائی ہوئی باتیں لکھنے لگا۔ باپ جھکا ہوا دیکھ رہا تھا کوئی بات باقی تو نہیں رہ گئی۔ جب سب ہدایتیں لکھ گئیں تب باپ نے اپنی عینک اُتاری۔ جیب سے رومال نکال کر شیشوں کو صاف کیا پھر لگائی اور مزید اطمینان کے لیے اس نے بیٹے کے ہاتھ سے نوٹ بک لے لی پھر

ہر سطر پر انگلی رکھ کر بڑے غور سے پڑھا۔ ٹھیک لکھا ہے یہ کہہ کر نوٹ بک واپس کردی۔
اس کو تم بہت احتیاط سے رکھنا کہیں کسٹم کے وقت جلدی میں گر نہ جائے
"اور پہنچتے ہی اپنی خیریت کا تار دے دینا سعید!"
"انشاءاللہ۔ پہلا کام یہی کروں گا۔"
چاروں طرف اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی بے چین ہو گئی میرے پہلوؤں میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور لاہور کا اسٹیشن خدا حافظ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ کسی منچلے نے تان کھینچی ؎

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی

میری چال سے سب ہی میں زندہ دلی آگئی تھی۔ تین چار مل کر گنگنانے لگے ؎

آ غربت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

یہ سن کر میں خوشی سے جھومنے لگی۔ بارش میں نہاتی ہوئی۔ جنگل اور ندیوں کو پار کرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ آج میری اہمیت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں میری جانب اشارہ کر کے خوش ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بچے تالیاں بجا رہے تھے۔ اب لاہور کا اسٹیشن بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ مسافر کھڑکیوں اور دروازوں سے ہٹ کر اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔ سعید نہ جانے کن خیالات میں گم تھا
"پاپا! انڈیا میں ایسی ہی ہماری دادی اماں ملیں گی جیسی ہماری سہیلی گل بانو کی ہیں؟"
"ہاں گڑیا! بالکل ویسی!"
اس ننھی سی آواز نے سعید کو چونکا دیا۔ اس نے آہستہ سے سوٹ کیس برتھ پر رکھا۔ ور تالا کھول کر کپڑوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ سب سے نیچے آسمانی رنگ کا پھول دار کپڑا نظر آیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے باہر نکال لیا پھر ویسی آسمانی رنگ کی بیش قیمت ساری نکالی وہ سوچنے لگا۔ معلوم نہیں۔ اب وہاں کون سے لباس کا فیشن ہوگا؟ ویسے تو ہندوستان میں زیادہ ساری پہننے کا رواج ہے مگر شلوار قمیص کا کپڑا بھی بہت خوبصورت ہے۔ اس کا

پسندیدہ آسمانی رنگ تو مجھے آج تک یاد ہے۔ کیا ہوا دونوں ہی تحفے میں دے دوں گا۔ ایک جوڑا ہندستانی دوسرا پاکستانی پھر دونوں کپڑوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان پر ہاتھ پھیر کر کپڑوں کی نرمائی کا اندازہ کیا۔ دونوں ہی نرم اور اچھے ہیں۔ مسکراتے ہوئے احتیاط سے سوٹ کیس میں تالہ لگا دیا۔

"اٹاری۔ ٹرین کتنے بجے پہنچے گی؟" سعید نے پاس بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا۔

"پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اور امرتسر کب تک پہنچیں گے؟"

"انڈیا میں کون ہے آپ کا بہت بے قرار نظر آ رہے ہیں؟"

سعید مسکرانے لگا۔ ہم سب ایک ہی منزل کے تو راہی ہیں۔ آؤ ہنس بول کر سفر کاٹیں۔ آپ تو خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔

اٹاری کا اسٹیشن آ گیا۔ ٹرین آہستہ آہستہ داخل ہو رہی تھی۔ سعید گنگنانے لگا۔

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بے قراروں کی

یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی

کسٹم کے مرحلے سے گزرنے کے بعد سب نے ہاتھ منہ دھویا۔ ایک صاحب نے بڑے شوق سے پوری بھاجی والے کو بلایا۔

"کس میں لیں گے جی؟ پلیٹ میں یا دونے میں؟"

"دونے میں دے دو بھائی!"

"کیا بچوں کی سی باتیں ہیں۔ پلیٹ میں لے کر کھاؤ۔" بڑے میاں نے ڈانٹا۔

"جب آگرہ کالج میں پڑھتے تھے تو ایسے ہی دونے میں لے کر کھاتے تھے۔ پچیس، تیس سال بعد یہ لطف آ رہا ہے!"

اٹاری پر دم لینے کے بعد ٹرین پھر روانہ ہوئی۔ سب کا اشتیاق اب اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں بھی جلد از جلد منزل پر پہنچنے کے لیے بیتاب تھی کیوں کہ ان سب کو ملانے میں بھی تو خاص لطف آئے گا۔

"لو بھائی! امرتسر آگیا" کسی نے چلّا کر کہا۔ سب بے چین ہو کر کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگے۔
"ہاں۔ہاں وہ اسٹیشن نظر آرہا ہے۔ سامان درست کر لو" کسی نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔
کیا جلدی ہے۔ دروازے سے ہٹو۔ گر پڑو گے" ایک بڑے میاں نے ڈانٹا اور خود بھی جھانکنے لگے۔
امرتسر اسٹیشن پر مجھے غیر معمولی ہجوم نظر آیا۔ میرے ٹھہرتے ٹھہرتے نہ معلوم کتنے ہاتھ ایک دوسرے سے مل چکے تھے۔ چاروں طرف محبت کے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ماضی کے نقش مٹا دیے گئے تھے اور مستقبل کے خواب نظر آرہے تھے۔ سعید نے سب سامان قلی کے حوالے کیا اور سوٹ کیس لے کر خود اُترا۔
"لکھنؤ جانے والی گاڑی کتنے بجے ملے گی؟" اس نے قلی سے سوال کیا۔ کسی نے آہستہ سے کندھے پر ہاتھ رکھا: "سعید!" ______ سعید نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ریشما کھڑی ہوئی ہے۔ گذرے ہوئے دنوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہی خوبصورت دلکش سراپا، وہی رسیلی میٹھی آواز، معلوم ہوتا تھا زمانہ اس کو نظر انداز کر کے گزر گیا ہے۔ آسمانی ساری میں ملبوس اس کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے بارش کے بعد دھلے ہوئے آسمان پر چاند چمکتا ہے۔ ماضی اور حال کے ملے جلے تصوّر نے چہرے کی رنگت کو گلنار کر دیا تھا۔ دونوں محویت کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی صرف نگاہیں دلی جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ اس سکوت کو قلی کی آواز نے توڑا۔

"صاحب! ٹکٹ لینا ہے؟"

"ٹکٹ۔ ہا۔ں۔ سعید نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔" میں دو ٹکٹ خرید چکی ہوں" ریشما نے دھیمی آواز میں کہا۔ سعید نے آگے بڑھ کر ریشما کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا: "خلاف امید یہاں تمھیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا لکھنؤ کے اسٹیشن پر ملاقات ہو گی۔
"اتنے دن کا انتظار کیا کم تھا جو اور کرتی؟" دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے جواب دیا۔

"میں نے بھی تمھارا انتظار کیا ہے ریشما!" بس یہ سمجھ لو ؎

نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے
دلوں میں نور چراغ اُمید فردا کا

ہجوم اور تنہائی

میرے بچپن کا زمانہ بہت خوبصورت تھا۔ دادی اماں۔ امّی اور چاچی سب مل کر ایک گھر میں رہتی تھیں۔ ہم سب بھائی بہنوں کی وجہ سے گھر میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دادی اماں سردیوں کے موسم میں شام کو سورج غروب ہوتے ہی اپنے نرم اور گرم بستر میں بیٹھ جاتی تھیں۔ پلنگ کے قریب آتش دان روشن کر دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے کمرہ بے حد گرم رہتا تھا۔ وہیں قریب میں نماز پڑھنے کے لیے چوکی بچھی ہوتی تھی۔ اس کے پاس اسٹول پر لوٹا اور نیچے وضو کرنے کے لیے سلفچی رکھی رہتی تھی۔ امّی یا چاچی مغرب، عشا کی نماز پڑھنے کے بعد دادی اماں کو اسی چوکی پر گرم گرم کھانا کھلا دیتی تھیں۔ پھر دادی اماں اپنا بڑا سا پیتل کا پاندان کھول کر اس میں سے پان بنا کر کھاتیں۔ ہم بچّوں کو چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تقسیم کر دیتیں۔ اسی طرح گرمیوں میں دادی اماں کا پلنگ آنگن میں چھڑکاؤ کر کے بچھا دیا جاتا تھا۔ ان کے سرہانے بیلے اور موگرے کے پھول مٹی کے کورے پیالے میں پانی میں ڈال کر بھگو دیے جاتے تھے تاکہ اس کی فرحت بخش خوشبو سے دادی اماں کو آرام کی نیند آ سکے۔

گرمی ہو یا سردی دوپہر میں اپنے اپنے کاموں سے فرصت کر کے محلّے کی عورتیں دادی اماں کے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ کسی کو بیٹی۔ بیٹے کی شادی کے سلسلے میں مشورہ

کرنا ہوتا تھا۔ کوئی جہیز کی فہرست دکھا کر رائے طلب کرتی تو کوئی دعوتِ ولیمہ کا اندازہ پوچھتی۔ دادی اماں سب کو معقول مشورے دیتیں اور سب خواتین دادی اماں کے اخلاق اور محبت کی تعریف کرتی شام کو رخصت ہو جاتیں۔ امی اور چاچی اپنے گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔

رات کو ہم سب بھائی بہن اپنا اپنا سبق یاد کر کے دادی اماں کے بستر میں داخل ہو جاتے وہ اپنا بڑا سا لحاف ہمارے اوپر ڈال دیتیں۔ ہم کہتے: "دادی اماں! کہانی سنائیے؟"

وہ پوچھتیں "پہلے یہ بتاؤ تم لوگوں نے اپنا سبق یاد کیا؟"

"جی ہاں، کر لیا" سب یک زبان ہو کر جواب دیتے۔

"اچھا پہلے بارہ امام اور پنجتن پاک کے نام سناؤ"

ہم وہ بھی سنا دیتے۔ پھر باری باری وہ سب سے قل اور الحمد سنتیں۔ اس کے بعد پوچھتی تھیں: "کون سی کہانی سناؤں؟"

"علی بابا چالیس چور" میرے چچا زاد بھائی جواب دیتے۔

"نہیں ہم تو وہ کہانی سنیں گے جس میں ایک راجا کی سات بیٹیاں تھیں۔ راجا نے پوچھا تھا تم کس کی قسمت کا کھاتی ہو؟ چھ نے جواب دیا آپ کی قسمت کا ساتویں نے جواب دیا اپنی قسمت کا۔ تو راجا نے خفا ہو کر اس لڑکی کو جنگل میں بھجوا دیا تھا۔

"ارے تمھیں کوئی جنگل میں نہیں بھجوائے گا۔ ڈرو نہیں" میرا بھائی جواب دیتا۔

"ساتویں ہے نا بچاری۔ اس لیے ڈرتی ہے" میرا بھائی احمد کہتا۔ ہاں دادی اماں! علی بابا چالیس چور سنائیے؟"

"نہیں ہم تو 'سفید جیسے برف' والی کہانی سنیں گے" فرخندہ بلند آواز میں کہتی۔

دادی اماں سب کی رائے سن کر پاندان کھولتیں اور ایک گلوری منہ میں رکھ کر کہتیں "دیکھو بچو! پہلے میں رخشندہ کی فرمائش پوری کروں گی اس کو بادشاہ والی کہانی سناؤں گی پھر فرخندہ بیٹی کی اس کے بعد علی بابا چالیس چور سننا۔"

چونکہ میں دادی اماں کو سب سے زیادہ پیاری تھی اس لیے وہ میری بات نہیں

ٹالتی تھیں۔ "ہا ہا جی۔ ہماری کہانی پہلے شروع ہوگی۔" میں اور فرخندہ تالیاں بجاتے۔

"دادی اماں! ان دونوں کو روک لیجیے ورنہ کل ہم ان کی ساری گڑیاں کنوئیں میں پھینک دیں گے۔" بھائی جان اور دوسرے بھائی جھنجھلا کر کہتے۔

"چپ رہو لڑکیو!" وہ آہستہ سے ڈانٹ کر مسکرادیتیں۔

ہم لوگوں کا شور سن کر چاچی اور امّی آجاتیں۔ کہتیں ان بچّوں کو اپنے کمرے سے نکال دیجیے۔ یہ آپ کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ "دلھن! یہ تو میرے کھلونے ہیں۔" دادی اماں سب کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتیں۔

کہانیاں سنتے سنتے ہم کب سو جاتے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو میں امّی کے جسم کی خوشبو سے پہچانتی کہ میں امّی کے بستر میں ہوں۔

ایک دن صبح ہی صبح گھر کے ملازم نواب نے آکر مجھے جگایا۔ چھوٹی بی بی! جلدی اٹھیے سب بچے آنند باغ جارہے ہیں۔ آنند باغ ہمارے یہاں ایسا ہی تھا جیسے بمبئی میں رانی باغ ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا اور نواب بغیر ناشتہ کرائے ہم سب بچّوں کو آنند باغ لے گیا۔ وہیں پر صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا کھایا۔ شام کو گھوم پھر کر واپس لوٹے تو دیکھا گھر میں سب چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ امّی۔ ابا جان۔ چاچا اور چاچی کی رونے کی وجہ سے آنکھیں سوج گیئں تھیں۔ ہم سب دادی اماں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ آنند باغ سے سب بھائی، بہن دادی اماں کے لیے پھولوں کا تحفہ لائے تھے۔ کمرے میں ایک شمع روشن تھی اور دادی اماں کا پلنگ تک نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر ہم سب حیران رہ گئے۔ پھوپی جان نے جلدی سے آکر ہم سب کو کمرے سے باہر نکالا۔ "یہاں تم سب کا کام نہیں ہے۔ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ہماری دادی اماں کہاں ہیں؟ ہم ان کو پھول دیں گے۔" ہم سب مچل گئے۔

ابا جان نے آکر پیار سے پھوپی جان کو گلے سے لگایا۔ اور ہم سب سے کہا "بٹیا! تم سب کی دادی اماں کربلا گیئں ہیں۔ آج نہیں ملیں گی۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھی بھرّاگئی۔

"کب گیئں؟ ہمیں ساتھ میں کیوں نہیں لے گیئں؟" میں نے رونا شروع کردیا۔

"تھوڑے دن کو گئی ہیں۔ آجائیں گی۔" ابّا جان ہم سب کو بہلا کر کمرے کے باہر لے گئے۔
"ہم سب ابھی دادی امّاں کے پاس جائیں گے۔ رات کو ہمیں کون کہانی سنائے گا" سب بچّوں نے چلّا چلّا کر رونا شروع کیا۔ تب امّی جان اٹھیں۔ سب کو خاموش کیا اور کہا "دیکھو اس طرح رونے سے دادی امّاں کو بہت تکلیف ہوگی۔ اب وہ کربلا میں رہیں گی وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔"

ہم دادی امّاں کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے بڑے ہو گئے۔ جب میں نے میٹرک پاس کر لیا تب معلوم ہوا جس روز تمام دن کے لیے ہم سب آنند باغ بھیج دیے گئے تھے اُسی دن اُن کا انتقال ہوا تھا۔

آج میں بھی عمر کی اسی منزل میں ہوں۔ میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹا شادی کے بعد وارڈن روڈ پر فلیٹ لے کر الگ رہتا ہے۔ حالانکہ میرا فلیٹ تین بیڈ روم کا بہت بڑا ہے۔ جس میں تین خاندان بڑے آرام سے رہ سکتے ہیں اور بڑی خوبصورت جگہ یعنی مالا بار ہل پر ہے۔ بیٹی نے بھی اپنے بھائی کے گھر کے قریب فلیٹ لے لیا ہے۔ میرے شوہر دن بھر آفس میں رہتے ہیں۔ شام کی چائے پی کر کلب چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے رات کو بارہ، ایک بجے واپس آکر اپنے بیڈ روم میں سو جاتے ہیں۔ ہم دونوں کے الگ الگ بیڈ روم ہیں۔ کبھی کبھی اتوار کی شام کو میرے بیٹے بہو اور بیٹی داماد آجاتے ہیں تو بچّوں کی وجہ سے گھر میں چہل پہل ہو جاتی ہے۔ پھر رات کا کھانا کھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ کبھی اتوار کے دن رات ہونے پر میں بچّوں سے کہتی ہوں: "آؤ تمھیں کہانی سناؤں!" تو مجھے جواب دینے کے بجائے اپنے والدین سے کہتے ہیں۔

"ممّی! گرینڈ مدر اسٹوری سنانے کو بولتا ہے۔ ہم کومک پڑھ رہے ہیں۔ پلیز ان سے بولیے بور نہ کریں۔"

بچّوں کے والدین کہتے ہیں: "ممّی! آپ ان کو ڈسٹرب نہیں کیجیے۔" میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ زمانے کی قدریں بدل چکی ہیں۔ بیٹا تو دو، تین ہفتے بعد آتا ہے لیکن بیٹی دوسرے تیسرے دن میری خیریت دریافت کرنے آتی ہے مگر نیچے گاڑی میں سے آواز دیتی ہے۔

"عبدل! ممی، پاپا کیسے ہیں؟"

عبدل میرا پرانا ملازم ہے وہ جواب دیتا ہے: "اچھے ہیں۔"

"ممی، پاپا کو بائی بائی بولو۔"

"بائی! آپ اوپر آیئے۔ اپنی ممی سے مل لیجیے وہ اکیلی ہیں۔"

"نہیں، میں اس وقت نہیں آسکتی۔ ایک میٹنگ میں جانا ہے پھر لنچ کے لیے گھر آکر تیار ہونا ہے۔ ہیر ڈریسر سے بال سیٹ کرانے ہیں۔ وہاں جانا زیادہ ضروری ہے۔ بائی بائی ممی! بائی بائی عبدل!" اور اس کی گاڑی فرّاٹے بھرتی گزر جاتی ہے۔ میں صرف آواز سنتی ہوں۔

مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے اور پیروں میں درد رہتا ہے۔ اس لیے زیادہ کہیں آنے جانے سے مجبور ہوں۔ نظر بھی کمزور ہوگئی اس وجہ سے پڑھنا لکھنا بھی کم ہوگیا ہے۔ بس روز صبح ناشتے کے بعد عبدل کے ساتھ گاڑی میں ہینگنگ گارڈن چلی جاتی ہوں۔ وہاں دوپہر تک بیٹھتی ہوں پھر گھر واپس آکر دوپہر کا کھانا کھاتی ہوں اور کچھ دیر آرام کرتی ہوں۔ شام کی چائے کے بعد پھر ہینگنگ گارڈن چلی جاتی ہوں اور رات تک بیٹھتی ہوں لیکن وہاں کے ہجوم میں بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے نوعمر لڑکے لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ بڈھے پارسی مرد اور عورتیں چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ بچے اپنی آیاؤں کے ساتھ جھولا جھولتے اور مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ بمبئی کی تہذیب میں بغیر جان پہچان کے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی مخاطب نہیں ہوتے میں خاموشی سے اس بھری پُری دنیا کا تماشا دیکھتی رہتی ہوں اور وقت گزر جاتا ہے۔ اللہ! عمر کے یہ سال کتنے طویل ہوگئے ہیں۔

ایک اتوار کی صبح میں اکیلی بنچ پر بیٹھی تھی۔ ایک آیا دو بچوں کی انگلی پکڑے ہوئے میرے قریب سے گزری۔ دونوں بچے اپنی آیا کا ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا بھاگے اور چلّانے لگے "بھوت بھوت" آیا نے ڈانٹا۔ "بابا لوگ کے لیے ایسا بات نہیں بولتے۔" بچے دور کھڑے ہوئے میرا منہ چڑاتے رہے۔ پھر انگریزی میں اپنی آیا سے کہا۔ "یہ عورت بھوت ہے۔ ہم نے کومک میں دیکھا ہے۔ بھوت کا سر بڑا اور سفید ہوتا ہے۔"

یہ سن کر مجھے اپنی دادی اماں کے بال یاد آگئے جو مثل چاندی کے چمکتے تھے اور ان میں ہلکا ہلکا گھونگھر تھا۔ ہم سب بھائی بہن اس بات پر لڑتے تھے اور ہر ایک کہتا تھا کہ دادی کے سر کی چاندی سب سے زیادہ میرے حصے میں آئے گی۔ آج کی دنیا میں وہی قابل قدر چیز بھوت ہونے کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔

ایک نو عمر جوڑا میرے قریب سے گزرا۔ لڑکی میرے پاس تھوڑی دیر کو رک گئی۔ لڑکے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "چلو ڈارلنگ!"

"بچاری بڑھیا اکیلی بیٹھی ہے۔"

"سو چو ڈارلنگ! اولڈ ایج والوں سے ہم کیا بات کر سکتا ہے۔"

"یس۔" دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میری دنیا ہینگنگ گارڈن تک محدود تھی۔ گھر کی وحشت ناک تنہائی سے یہاں چند گھنٹوں کو نجات مل جاتی تھی۔ یہاں کی تر و تازہ ہوا، اچھلتے ہوئے فوارے اور ہنستے کھیلتے ہوئے لوگوں میں مجھے ایک نئی دنیا کا لطف آتا تھا جس سے میری طبیعت دوسرے روز تک تر و تازہ رہتی۔

ایک شام حسب معمول آکر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور وہاں کے دلچسپ مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ دو، تین آیاؤں کی آوازے میں چونک پڑی وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اشارے سے پوچھا۔

"ہم یہ بولتا ہے میم صاب! آپ کو دوسرے گارڈن میں اپنا ٹائم پاس کرنا مانگتا ہے۔" دوسری آیا نے کہا: "یہ گارڈن بابا لوگ کے کھیلنے کا ہے۔ وہ ہر دن آپ کو یہاں بیٹھا دیکھ کر بہوت گھبراتا ہے۔ اولڈ ایج والا لوگ بازو کے گارڈن میں جاتا ہے۔"

"کل بابا اور بے بی کو فیور ہو گیا۔ اس کے ڈیڈی نے ہم کو بوم مارا۔ ممی نے بولا۔ آپ کہیں اور بیٹھا کریں۔ ہم لوگ بہت دکھی ہو گیا ہے آپ سے۔"

ایک بڑی عمر کی آیا نے نرمی سے کہا "معاف کرنا۔ سالا ہم لوگ کا کیا قصور ہے۔ صاب لوگ ذرا سی بات پر اپن کی چھٹی کر دیتا ہے۔"

میں نے ان کی باتیں سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ نیچے چوپاٹی اور نیلے پیالہ نما سمندر کو دیکھنے لگی۔ جہاں سوائے سروں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کل سے یہ منظر بھی میرا ساتھ چھوڑ دے گا اور میری تنہائی کی ساتھی صرف ماضی کی خوشگوار یادیں ہوں گی۔